انتظار حسین
کے
دو غیر مطبوعہ اُردو اسٹیج ڈرامے

تحقیق و تنقید، ترتیب متن: ڈاکٹر محمد نوید

ادارہ فروغِ اُردو، لاہور

انتظار حسین کے دو غیر مطبوعہ اُردو اسٹیج ڈرامے
تحقیق و تنقید، ترتیب متن: ڈاکٹر محمد نوید

انتظار حسین

کے

دو غیر مطبوعہ اُردو اسٹیج ڈرامے

تحقیق و تنقید، ترتیب متن

ڈاکٹر محمد نوید

ادارہ فروغ اُردو، لاہور

انتساب!

اُستادِ محترم سرمد صہبائی

اور

اُستاذی اصغر ندیم سیّد

کے

نام

فہرست

نمبر شمار		صفحہ نمبر
☆	دیباچہ	۷
☆	انتظار حسین کے دو نایاب اُردو اسٹیج ڈرامے:	۱۱
☆	انتظار حسین کے دو غیر مطبوعہ اسٹیج ڈراموں کا متن:	
۱۔	متن: نیا گھر (طبع زاد، ۲۴ مئی ۱۹۷۵ء)	۲۹
۲۔	متن: بھنور (ماخوذ، مئی ۱۹۹۳ء)	۹۷
☆	ضمیمہ جات	
۱۔	ڈرامہ نیا گھر: پہلا صفحہ	۱۷۳
۲۔	: آخری صفحہ	۱۷۴
۳۔	ڈرامہ بھنور: پہلا صفحہ	۱۷۵
۴۔	: آخری صفحہ	۱۷۶

دیباچہ

انتظار حسین پاکستان کے رواں صدی کے سب سے بڑے ادیب ہیں کہ جن کے فن کی مختلف جہات ہیں ۔اُنھوں نے اُردو افسانہ نگاری ،ناول نگاری، کالم نگاری، ڈراما نگاری اور تنقید کی اصناف میں طبع آزمائی کر کے اپنے فن کا لوہا منوایا۔انتظار حسین معاصر ادب کا نہایت معتبر حوالہ ہیں ۔اُنھوں نے اپنے مضامین، افسانوں اور ناولوں کے ساتھ ساتھ کالموں میں مختلف بڑے پس نوآبادیاتی مسائل کی نشاندہی کی کیونکہ وہ نوآبادیاتی اور پس نوآبادیاتی دور کے عینی شاہد تھے۔اُن کی ایک اور فنی جہت ڈراما نگاری بھی ہے ۔اُنھوں نے لاہور میں ہونے والے اُردو تھیئٹر کے سلسلے میں کئی کالم بھی تحریر کیے، جن میں اُردو تھیٹر کے حُسن و قبح کی نشاندہی کرتے ہوئے اُنھوں نے نوآموز ڈراما نگاروں، اداکاروں اور ہدایت کاروں کی درست سمت رہنمائی کا فریضہ سر انجام دیا۔انتظار حسین کے ڈرامے چونکہ آسانی سے دستیاب نہیں تھے لہٰذا اُردو ادب اور ڈرامے کے قارئین انتظار حسین کے فنِ ڈراما نگاری سے فیض یاب نہ ہو سکتے تھے کیونکہ اُنھوں نے افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی اصناف کی مانند ڈراما نگاری کے میدان میں بھی مختلف تجربات کیے ہیں۔انتظار حسین نے دیگر اصنافِ ادب کی طرح اُردو ڈرامے کی مختلف صورتوں پر طبع آزمائی کی ،جن میں اسٹیج ڈرامے سے لے کر ریڈیائی اور ٹی وی ڈرامے شامل ہیں جو ایک ڈراما کی صنف ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف میڈیم (ذرائع ابلاغ) سے متعلق ہیں اور انتظار حسین کا ان تینوں صورتوں کے ڈرامے میں کامیاب ہونا غیر معمولی امر ہے۔طبع زاد ڈراموں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے مختلف مغربی ڈراموں کے تراجم بھی نہایت عمدگی سے کیے ہیں۔انتظار حسین کے

یہ ڈرامے کتابی صورت میں طبع نہیں ہوئے تھے اور ان میں سے بعض ڈرامے تو شائع بھی نہیں ہوئے تھے چنانچہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے اس ادبی خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور اتفاق سے انتظار حسین کی رحلت کے کچھ ہی ایام کے بعد اُن کے ڈراموں کا مجموعہ خوابوں کے مسافر کے عنوان کے تحت ۲۰۱۶ء میں منظرعام پر آیا۔

سنگ میل پبلی کیشنز سے طبع شدہ انتظار حسین کے ۳۷۶ صفحات پر مشتمل ڈراموں کے مجموعہ خوابوں کے مسافر کی ترتیب کچھ یوں مرتب کی گئی ہے کہ ابتدا میں آصف فرخی کا انتظار حسین کی ڈراما نگاری پر تفصیلی عمدہ مضمون بعنوان پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ شامل کیا گیا ہے اس کے بعد ضیا محی الدین کے انگریزی سے ترجمہ شدہ خط کو کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ بعدازاں تین اسٹیج ڈرامے خوابوں کے مسافر، اٹھواں سوال اور نئی عورتیں پرانی لڑکیاں، پھر دو ٹی وی ڈرامے پانی کے قیدی اور نفرت کے پردے میں شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری حصہ میں دو ترجمہ شدہ ڈرامے جن میں ایک وجے تیندولکر کا ترجمہ خاموش، یہ عدالت ہے اور دوسرا تھارنٹن وائلڈر کا ہماری بستی ہیں۔ بلاشُبہ اُردو ڈراما نگاری اور خصوصاً انتظار حسین کے حوالے سے یہ ایک نہایت وقیع ادبی خدمت ہے لیکن اس کتاب میں انتظار حسین کے دو اہم اسٹیج ڈرامے نیا گھر اور بھنور شامل نہیں کیے گئے ان میں سے ایک اُن کا اپنا طبع زاد ڈراما نیا گھر اور دوسرا ہنرک ابسن کے ڈراما wild duck کا ترجمہ بھنور ہے۔

استادِ محترم سیّد اصغر ندیم اور استاذی ڈاکٹر سہیل احمد خان صاحب کے توسط سے ایم اے اور ایم فل اُردو (جی سی یونیورسٹی لاہور) کے دوران انتظار حسین صاحب سے اکثر ملاقات کی صورت رہی۔ اسی دوران انتظار حسین صاحب سے سعادت منٹو اور اُردو تھیٹر کے حوالے سے انٹرویوز بھی کیے۔ ۲۰۰۸ء میں میں نیشنل کالج آف آرٹس کے تھیٹر ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھا تو یہاں اُردو تھیٹر کے حوالے سے آرکائیوز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ تھیٹر ڈیپارٹمنٹ درس وتدریس کے ساتھ

اردو اسٹیج ڈراموں کے غیر مطبوعہ سکرپٹس کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں دیگر ڈرامہ نگاروں کے علاوہ انتظار حسین صاحب سے رہنمائی اور ان کے دو غیر مطبوعہ اسکرپٹس جن میں نیا گھر اور بھنور کے مسودے اشاعت کے لے حاصل کیے جو انھوں نے الحمرا آرٹس کونسل لاہور سے منگوا کر دیے تھے۔ ان ڈراموں کے اصل مسودے مع فوٹو کاپی اب بھی الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں موجود ہیں۔ نیشنل کالج آف آرٹس کا تھیٹر ڈیپارٹمنٹ بند ہو جانے کی وجہ سے اردو اسٹیج ڈراموں کے غیر مطبوعہ سکرپٹس شائع نہیں ہو سکے میری کوشش ہے کہ میں ان ڈراموں کے پیش کروں تا کہ پاکستانی اردو اسٹیج ڈرامے کے نمائندہ ترین اہم ڈرامے قارئین اور محققین تک پہنچ سکیں اور پاکستانی اردو اسٹیج ڈرامے پر تحقیق و تنقید کی نئی راہیں کھل سکیں۔ میری یہ کاوش اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ یہ دونوں اسٹیج ڈرامے بغیر کسی ترمیم و اضافے کے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان ڈراموں کے مسودے ہر قسم کے آزار یعنی آب زدگی اور کرم خوردگی سے محفوظ ہیں اور کوئی ورق کٹا پھٹا ہوا نہیں ہے۔ محض چند سطریں سیاہی اُڑ جانے کی وجہ سے قابلِ قرأت نہیں جو حسب ذیل ہیں۔ اصل مسودہ بھنور: صفحہ نمبر ۱۶، صفحہ نمبر ۲۷، صفحہ نمبر ۵۰، صفحہ نمبر ۶۰، صفحہ نمبر ۶۶، صفحہ نمبر ۶۷ کی آخری آخری سطر قابل قرأت نہیں ہیں۔

ڈاکٹر محمد نوید
وزٹنگ فیکلٹی، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

انتظار حسین کے دو نایاب اُردو اسٹیج ڈرامے

انتظار حسین اُردو فکشن کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ ڈبیائی ضلع بلند شہر میں ۷ دسمبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ بی اے میرٹھ کالج سے کیا۔ کچھ عرصہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے پھر تقسیم کے بعد لاہور میں منتقل ہو گئے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے اُردو کیا اور صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ روزنامہ مشرق میں ان کا کالم لاہور نامہ بہت مقبول ہوا۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے لیے بھی کالم لکھتے رہے۔ کالم نگاری کے علاوہ افسانہ، کہانی، ناول، ڈرامہ، آپ بیتی اور تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کے حسب ذیل مجموعے شائع ہوئے:

گلی کوچے (۱۹۵۳ء)، آخری آدمی (۲۰۰۲ء) نیا گھر (۲۰۰۲ء)، چاند گہن (۲۰۰۲ء)، شہرزاد کے نام (۲۰۰۲ء) نظریے سے آگے (۲۰۰۴ء)، بوند بوند (۲۰۰۴ء)، نئی پود (۲۰۰۵ء)، ناؤ اور دوسری کہانیاں (۲۰۰۵ء)، نئی پرانی کہانیاں (۲۰۰۶) کنکری (۲۰۰۷ء) دن اور داستان (۲۰۰۷ء) دلی تھا جس نام (۲۰۰۷ء) سرخ تمغۂ (۲۰۰۷ء) مجموعہ انتظار حسین (۲۰۰۷ء) خالی پنجرہ، (۲۰۰۸ء)، علامتوں کا زوال (۲۰۰۹)، قطرے میں دریا (۲۰۱۰ء)، شہرِ افسوس (۲۰۱۱ء)، کچھوے (۲۰۱۱ء)، جنم کہانیاں (۲۰۱۱ء)، ہزار داستان، (۲۰۱۱ء)، قصہ کہانیاں (۲۰۱۱ء)، خیمے سے دور (۲۰۱۲ء)، چراغوں کا دھواں (۲۰۱۲ء)،

گھاس کے میدانوں میں(۲۰۱۲ء)، بستی (۲۰۱۳ء)، ملاقاتیں(۲۰۱۳ء)، سعید کی پر اسرار زندگی (۲۰۱۳ء)،شکستہ ستون پر دھوپ(۲۰۱۳ء) ،جستجو کیا ہے(۲۰۱۴ء)،سنگھاسن بتیسی (۲۰۱۴ء)،آگے سمندر ہے(۲۰۱۶ء)،سخن اور اہل سخن(۲۰۱۶ء)اور خوابوں کے مسافر (۲۰۱۶ء)وغیرہ شامل ہیں(۱ے)۔

انتظار حسین کوحکومت پاکستان نے ۱۹۸۷ء میں ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا۔اکادمی ادبیات پاکستان نے''کمال فن ایوارڈ'' پیش کیااور حکومت فرانس نے ستمبر ۲۰۱۴ء میں''آفیسر آف دی آرٹس اینڈ لیٹرز'' عطا کیا۔دوفروری ۲۰۱۶ء کوتقریباً ۹۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

انتظار حسین جدید اُردو اسٹیج ڈرامے کا ایک اہم نام ہے۔پاکستان آرٹس کونسل لاہور(الحمرا آرٹس کونسل لاہور) کے شروع کے زمانے میں جہاں، بانو قدسیہ(۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء)،کمال احمد رضوی (یکم مئی ۱۹۳۰ء۔۱۷ دسمبر ۲۰۱۵ء) ، ڈاکٹر انور سجاد(۲۷ مئی ۱۹۳۵ء)،شعیب ہاشمی (۱۵فروری ۱۹۳۹ء۔۲۰ مارچ ۲۰۰۶ء)،جمیل بسمل (۱۹۴۲ء۔۱۲ مئی ۲۰۰۵ء)، عائشہ تسلیم(۱۹۴۴ء)سرمد صہبائی(۱۹ نومبر ۱۹۴۵ء) ، شوکت زین العابدین(۱۹۴۸ء)اور اصغر ندیم سیّد(۱۴ جنوری ۱۹۵۰ء)وغیرہ نے جدید اُردو اسٹیج ڈرامے کو فروغ بخشا۔وہاں انتظار حسین کے بھی یہ غیر مطبوعہ دوسکرپٹس (scripts)نیا گھر اور بھنور بھی جدید اُردو اسٹیج ڈرامے کی تاریخ کا اہم حوالہ ہیں۔

انتظار حسین کا کھیل نیا گھر ۲۴ مئی ۱۹۷۵ء میں نجمہ آرٹ سوسائٹی نے الحمرا لاہور آرٹس کونسل میں پیش کیا(۲ے)۔اس اسکرپٹ پر انور علی کا تب کا نام رقم ہے۔یہ اسکرپٹ A4 سائز کے ۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کھیل کے صفحہ اوّل پر اداکاروں کے نام بھی درج ہیں۔جن میں انجمن،انور علی (جنوری ۱۹۴۵ء)،عطیہ شرف اور ناہید شامل ہیں۔کھیل کے صفحہ اوّل اور آخری صفحہ پر انتظار حسین کے دستخط کے ساتھ 24/5/75 کی تاریخ درج ہے۔

یہ کھیل چارا یکٹ (act) پر مشتمل ایک ٹریجڈی (Tragedy) ہے۔اس میں وقت ایک تسلسل (linear time) کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔کھیل کی کہانی کا دورانیہ چند دنوں پر مشتمل ہے۔ اس کھیل میں تہذیبی المیے کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک تہذیب جو دَم توڑ رہی ہے جس سے تہذیبی قدریں متاثر ہو رہی ہیں اور ایک نئ تہذیب کے آثار بھی نمودار ہو رہے ہیں۔ اس نئ تہذیب کے اپنے رنگ ڈھنگ، اپنا ایک مزاج اور ماحول ہے۔ اس نئ فضا میں پرانی قدروں سے وابستہ ذہنوں اور نئ اقدار کی حامل نسل کا تصادم ابھرتا ہے۔ یہ تصادم خارجی (external conflict) سطح پر بھی ہے اور داخلی کشمکش (Internal conflict) کو بھی پیش کرتا ہے جیسا کہ اس کھیل میں نیم والی آپا، کچے مکان والی بشیرن اور تحصیلدارنی پرانی تہذیب سے وابستہ خواتین ہیں جبکہ ماجد، زاہد اور شمیم وغیرہ نئ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اُردو شعر و ادب کا، ہجرت ایک عام موضوع رہا ہے لیکن ہجرت سے پیدا ہونے والے تہذیبی اور ذہنی المیے کو الحمرا آرٹس کونسل لاہور میں پہلی بار نیا گھر میں پیش کیا گیا ہے، جس میں ایک تہذیب دم توڑ رہی ہے۔ اس تہذیب سے وابستہ افراد اپنی روایات، رسومات اور عقائد کو بکھرتے دیکھ رہے ہیں، جگہوں اور اشیا کے ساتھ ذہن اور عقائد و روایات بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔نئ اور پرانی نسل کے ذہنی ٹکراؤ سے معاشرے میں ایک تہذیبی ٹکراؤ اور ذہنی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔

اس کھیل کا سادہ پلاٹ یوں ہے کہ ایک چپڑاسی نیم والے گھر میں ساری زندگی گزار دیتا ہے۔اس کی بیوی کو سب محلے والے ''نیم والی آپا'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا ماجد امریکہ سے وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہیں امریکہ ہی میں قیام پذیر ہو جاتا ہے۔ پھر اپنے چھوٹے بھائی زاہد کو بھی امریکہ بلوا لیتا ہے۔ زاہد امریکہ سے کوئی ڈپلومہ وغیرہ کر کے واپس آ جاتا ہے۔زاہد، نیم والا مکان چھوڑ کر ایک کوٹھی کرائے پر لیتا ہے۔نیم والی آپا کا سب پرانا سامان ہٹا کر گھر میں نئ نئ چیزیں سجا دیتا ہے لیکن نیم والی آپا ہر نئ چیز کو ناپسند کرتے ہوئے اپنی پرانی چیزوں کو یاد کرتی ہے۔زاہد، سوسائٹی میں اپنی پوزیشن (position) اور سٹیٹس (status) ظاہر

کرنے کے لیے اپنی بہن کے جہیز کا سارا سامان مختلف کمروں میں سجا دیتا ہے۔اس طرح بیٹی کی شادی کے لیے والدہ نے جو رقم ڈاکخانے میں محفوظ کی تھی۔وہ بھی آہستہ آہستہ نکلوا کر گھر کی آرائش پر لگا دیتا ہے۔نیم والی آپا کو ماجد سے بڑی امید ہے کہ وہ امریکہ سے اپنی بہن کے لیے جہیز کا سامان بھیجے گا۔باقی گھر والے بھی اسی امید پر شاہ خرچیاں کر رہے تھے لیکن ایک دن ماجد کا خط آتا ہے کہ اس نے وہاں شادی کر لی ہے اور اب اس کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو خرچ بھیجے۔ادھر زاہد بھی مختلف جگہ انٹرویو کے لیے جاتا ہے لیکن اسے بھی کہیں ملازمت نہیں ملتی۔نیم والی آپا کے گھر میں کچے گھر والی، تحصیلدارنی اور بشیرن آتی جاتی ہیں۔بشیرن کو رشتے ناطے کروانے کی لت پڑی ہے، وہ کسی کا بھی جوان بیٹا بیٹی دیکھے تو کہیں نہ کہیں رشتہ کرانے کی کوششیں شروع کر دیتی ہے۔بشیرن، تحصیلدارنی سے نیم والی آپا کی بیٹی شمیم کے سلسلے میں بات کرتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ اس کا بھائی امریکہ سے جہیز بھیجے گا۔لڑکی خوبصورت، خوب سیرت اور سعادت مند ہے۔ادھر نیم والی آپا کا بھی ذہن تیار کرتی ہے کہ تحصیلدارنی کا بیٹا ہیرا ہے ۔اس کے گھر میں جا کر، تمہاری بیٹی راج کرے گی۔کچھ دن رشتے کی بات چلتی ہے۔اِدھر کچے گھر والی بھی ان کی ٹوہ میں رہتی ہے کہ بشیرن رشتوں کا گٹھ جوڑ کر رہی ہے۔کچے گھر والی تحصیلدارنی کو بتاتی ہے کہ میں نے سنا ہے کہ نیم والی آپا کے امریکہ والے بیٹے نے وہاں میم سے شادی کر لی ہے اور یہاں انھیں خرچ بھیجنا بند کر دیا ہے۔اس خبر پر تحصیلدارنی، بشیرن سے ناراض ہوتی ہے کہ تم نے مجھے بتایا نہیں ہے۔بشیرن لاعلمی کا اظہار کرتی ہے اور تحصلیدارنی سے وعدہ کرتی ہے کہ میں آج ہی نیم والی آپا سے مل کر پوچھ لیتی ہوں کہ جہیز میں کیا کچھ دے رہی ہے۔تمھیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ وہ ایسی ویسی نہیں اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔بشیرن نیم والی آپا کے گھر آتی ہے اور اسے کہتی ہے۔تم لڑکی والی ہو، لڑکے والوں کے ذرا نازنخرے ہوتے ہیں۔جہیز کے سامان کی لسٹ بنا کر مجھے دو تاکہ میں بات پکی کروں۔نیم والی آپا اپنی بیٹی اور خاوند کو بلا کر سامان کی لسٹ تیار کروانے لگتی ہے لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جہیز کا سارا سامان تو اس کے بیٹے نے گھر میں

سجا لیا ہے۔ اب نہ بنک میں کچھ بچا ہے، نہ امریکہ سے کچھ آئے گا۔ زاہد کی ملازمت بھی نہیں ہوئی۔ زاہد کو جب پتا چلتا ہے کہ والدہ شمیم کے جہیز کے لیے پریشان ہے تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے کہ یہ جہیز وغیرہ پرانی باتیں ہیں۔ آج کل صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو۔ ہم کوئی جہیز نہیں دیں گے۔ بشیرن خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ اس دوران زاہد کو ایک رجسٹری موصول ہوتی ہے۔ سب خوش ہوتے ہیں کہ شاید امریکہ سے آئی ہو یا زاہد کو ملازمت کی آفر آ گئی ہو لیکن زاہد بتاتا ہے کہ یہ تو گاڑی کی پرانی قسطوں کا نوٹس ہے۔ کل ہی پیسے جمع کروانے ہیں۔ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ شمیم اٹھتی ہے اور خاموشی سے اپنے جہیز کے زیوارات لا کر زاہد کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ زاہد اٹھا کر لے جاتا ہے۔ سب ڈرائنگ روم سے نکل سے جاتے ہیں ۔صرف شمیم دیوار کے ساتھ لگی رو رہی ہے۔ اس طرح کھیل کا اختتام سوگوار ہوتا ہے۔

کھیل کے مردارنہ کرداروں میں زاہد کا کردار بہت متحرک ہے۔ زاہد اپنا سٹیٹس ظاہر کرنے کی دھن میں لگا ہے۔ اس نے گھر میں منجوداڑو اور گندھارا آرٹ کے نمونے، تجریدی پینٹنگ، ڈائنگ ٹیبل، صوفے، ٹیلی ویژن، فریج، قالین اور بڑی سی کار خرید کر گھر کا ماحول تبدیل کرلیا ہے۔ اس کے نزدیک رشتوں سے زیادہ اہم اپنا سٹیٹس ظاہر کرنا ہے۔ وہ اپنے والد کو منع کرتا ہے کہ والدہ کو ''زاہد کی اماں'' نہ کہا جائے بلکہ ''بیگم'' کہہ کر پکارا جائے۔ اس طرح اپنی والدہ کو بھی منع کرتا ہے کہ وہ ''آوٹ ڈیٹ محاورات نہ بولا کریں، سیدھی بات کریں، آپ نے کیا کہنا ہے''۔ ماجد اپنی بہن شمیم کو تجریدی پینٹنگ لا کر دکھاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ ''نئی عورت'' ہے۔ زاہد اپنے چھوٹے بھائی کو ''اماں'' اور ''ابا'' کے الفاظ استعمال نہیں کرنے دیتا۔ اسے کہتا ہے کہ ''ممی'' اور ''ڈیڈی'' کہا کرو۔ اس طرح یہ نئی نسل کا نوجوان ایک تہذیبی المیے کی علامت بن جاتا ہے جو پرانی چیزوں، رسم و رواج اور رشتے ناطے ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے سب کچھ نیا چاہے، نئے لفظ، نئے معنی، نئے نام، نئے رشتے اور استعمال کی نئی چیزیں۔ اسے وہ دوست پسند ہیں جو کافی پیتے ہیں۔ جن کے پاس کار اور بنگلہ ہے۔ وہ اپنی بہن کو جہیز دینے کی رسم کو ایک فضول رواج

سمجھتا ہے۔ڈراما نگار نے اس کردار کے ذریعے عہد کی تبدیلی اور نئی سوچ کے عمل کو پیش کیا ہے۔

اس کھیل کے تمام نسوانی کردار روایتی قسم کے ہیں۔نیم والی آپا پرانے محاورے بڑی روانی سے بولتی ہے۔وہ اس نئے گھر میں خوش ہے لیکن یاد کرتی ہے کہ نیم والے گھر کی بات ہی کچھ اور تھی۔نیم کا پیڑ برکت والا تھا۔اسے بار بار نیم والا گھر یاد آتا ہے۔جہاں اس کی شادی ہوئی۔ اس کے بچے پیدا ہوئے۔وہ اب بھی گھر میں پیتل کا لوٹا رکھنا چاہتی ہے۔اس کے گھر کی سب پرانی چیزیں ختم ہوگئیں لیکن اس کا پان دان ابھی بھی موجود ہے۔وہ اب نئے گھر میں بھی اپنے ملنے والی سہیلیوں کو پان بنا بنا کر پیش کرتی ہے۔وہ گھر میں ناگ منی،گندھارا آرٹ اور موہنجوداڑو کی ڈانسنگ گرل کا مجسمہ وغیرہ کو نحوست قرار دیتی ہے۔یہ اس معاشرے میں جہیز کی اہمیت کو سمجھتی ہے۔جب اس کے بیٹے جہیز کا سامان استعمال کرتے ہیں تو اس کا دل خون ہو جاتا ہے۔ماجد جب انٹرویو کے لیے جانے لگتا ہے تو وہ زبردستی بیٹے کو روک کر اس کے بازو کے ساتھ امام ضامن باندھتی ہے۔اسے امام کے سپرد کرتے ہوئے اس کے سر پر قرآن پاک کا سایہ کرتی ہے اور اس کا ہاتھ آٹے والی تھالی میں رکھ کر رخصت کرتی ہے۔اس کے جانے کے بعد وہ کامیابی کے لیے منتیں مان رہی ہے۔یہ کردار اپنے اندر پرانی تہذیب،اقدار،رسم و رواج اور پرانے رشتوں ناطوں کو سموئے ہوئے ہے۔ڈرامہ نگار اپنی پرانی تہذیب کو اس کے کردار کے ذریعے پیش کر رہا ہے جو ابھی زندہ ہے لیکن اس میں تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔

تحصیلدارنی روایتی قسم کی لالچی خاتون ہے جو چاہتی ہے کہ اس کے گھر میں وہ بہو آئے جسے جہیز میں سب سے زیادہ سامان ملے۔بشیرن،کچے گھر والی اور تحصیلدارنی بہت گھاگ خواتین ہیں۔مثلاً ان تینوں کے کرداروں کے چند مکالمات ملاحظہ کیجیے:

تحصیلدارنی:اے ہے تم نے تو یاں آ کے لڑنا شروع کر دیا۔

بشیرن: میں تو چھپ بیٹھی ہوں یہی لڑنے پہ تلی بیٹھی ہے۔

کچے گھر والی:تم نے یہ کیوں کہا کہ جو بات نہیں ہوتی وہ بھی تو کہتی ہے(سنبھل کر بیٹھتی ہے)بتاؤ

میں نے کیا کہا؟

بشیرن: تو نے یہ کہا کہ نیم والی آپا کے گھر تو سوکھی لڑکی ہے۔

کچے گھر والی: اوّل تو میں نے یہ کہا نہیں۔ اور کہا بھی ہو تو کیا جھوٹ کہا۔

بشیرن: وہ باپ بھیّوں والی ہے۔ سوکھی لڑکی کیسے ہو جائے گی۔

کچے گھر والی: خیر نائی نائی بال کتنے ججمان جی آگے ہی آتے ہیں تو اب تو بیاہ ہو ہی رہا ہے۔ پتہ چل جائے گا کہ کتنا جہیز چڑھا ہے۔

بشیرن: ہاں وقت آنے دو دنیا دیکھ لے گی کہ باپ بھیّوں نے بیٹی کو کیا دیا۔

کچے گھر والی: اس وقت کیوں دنیا دیکھے بھئی قاعدہ تو یہ ہے کہ بیٹی والے پہلے بیٹے والے کو بتا دیتے ہیں کہ ہم کیا دیں گے تاکہ وقت پر جھگڑا فساد نہ ہو۔ کیوں تحصیلدارنی بوا۔

تحصیلدارنی: بی بی لڑنا بھڑنا تو مجھے آتا نہیں۔ اور نہ میں ان میں سے ہوں جو پہلے سے شرطیں طے کرتی ہیں کہ جہیز میں یہ یہ آنا چاہیے مگر بی بی مجھے اور کیا دیکھنا رہا۔ یہی ایک بچہ ہے تو میں تو یہ چاہوں ہوں کہ میری ساری حسرتیں پوری ہوں۔

کچے گھر والی: خدا تمہارا بھلا کرے یہی میں کہہ رہی ہوں۔

بشیرن: (کھڑے ہوتے ہوئے) تحصیلدارنی بوا جہیز کا معاملہ میں ابھی جا کے طے کرتی ہوں۔ تمھیں اتنا ملے گا کہ گھر بھر جائے گا۔ مگر ایک بات کہتی ہوں کہ تم برادری والیوں کے جھرّے میں آ ؤ گی تو یہ تمہارے بیٹے کی شادی کہیں نہ ہونے دیں گی۔ (۳)۔

ڈرامہ نگار نے ان کرداروں کے ذریعے زبان کی تہذیبی مٹھاس کو بھی ایک اثاثے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے میں یہ کردار بڑی روانی سے روزمرہ، محاورات اور ضرب المثل میں بات کرتے ہیں۔ مثلاً ''عید کا چاند ہونا''، ''ہاتھ کا میل''، ''کیا سوکھی کیا گیلی''، ''چاند چڑھے کل عالم دیکھے''، ''سر کے بال سفید ہونا''، ''بات بات پر زبان پکڑنا''، ''ایک کی سو سو بننا''، ''اللہ اللہ کرنا''، ''چندرا چندرا کے باتیں کرنا''، ''گھی دودھ دنیا سے اڑنا''، ''ناک پہ مکھی نہ بیٹھنے دینا''، ''عرشِ معلّٰی پر دماغ ہونا''، ''بیری والے گھر اینٹیں آنا''، ''سر میں لال ٹانکنا''، ''سو میں

ایک ہونا''،''مزاج درست کرنا''،''پانی پھرجانا''،''سالن میٹھا میٹھا لگنا''،''آلتی پالتی مار بیٹھنا''،''چٹے طوفان باندھنا''،''دماغ کا کیڑا بلبلانا''،''چھوئی موئی ہونا''،''کیڑے نکالنا'' ،''ہوش کی دوا لینا''،''ٹوہ لینا،جمع خاطر رکھنا''،''آدمی آخر آدمی ہے''،''سوئی کا بھالا بنانا''، ،''اوچھے کے گھر تیتر باہر رکھوں کہ بھیتر''(مثل)،''نائی نائی بال کتنے ججمان جی آگے ہی آتے ہیں''(مثل)اور،''جھرّ ے میں آنا''،جیسی عمدہ زبان پیش کرنا اُردو زبان کا شاندار سرمایہ ہے ۔جس زمانے میں یہ کھیل پیش ہوا۔اس دور میں سکرپٹ کمیٹی بھی بہت متحرک تھی۔کھیل کوفنی اور فکری حوالے سےتو دیکھا ہی جاتا تھامگرلسانی حوالےکوبھی بہت اہمیت تھی۔ڈرامہ نگاراگرکہیں کوئی سخت لفظ لکھ دیتا تو اسے الحمرا آرٹس کونسل لاہور کی سکرپٹ کمیٹی تبدیل کروائے بغیرسکرپٹ منظور نہیں کرتی تھی۔انتظارحسین نے اپنے مذکورہ اسکرپٹ میں ایک جگہ کوئی سخت لفظ استعمال کیا تو انھیں اسکرپٹ کمیٹی نے اس لفظ کوکاٹ کراورتبدیلی کے بعد یہ کھیل پیش کیا گیا۔(۴)۔

اس کھیل میں دوسیٹ استعمال ہوئے ہیں۔پہلے ایکٹ،دوسرااور چوتھے ایکٹ میں ماجد کے نئے مکان کا سیٹ لگایا گیاہے جوکوٹھی کا کشادہ کمرے والا ہے۔پہلے ایکٹ میں اس کمرے کے اندرسامان بے ترتیبی سے پڑا ہے دوسرے اور چوتھے ایکٹ میں یہ کمرہ تبدیل ہوتا جاتا ہے۔اس کے اندر آہستہ آہستہ،صوفے،ڈرائنگ ٹیبل،تجریدی پینٹنگ،مجسمے،قالین،ٹیلی ویژن،ٹیپ ریکارڈر،فریج جیسا سامان جمع ہوجاتا ہے۔ایکٹ نمبر تین میں دوسرا سیٹ استعمال ہوا ہے جوتحصیلدارنی کے گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ ہےجس میں عام سی چیزیں ہیں مگر بہت سلیقے اور قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔

فنی اورفکری حوالے سے یہ بہت جامع کھیل ہے۔اس میں تہذیبی المیے کو بڑے منطقی انداز میں پیش کیا ہے۔الحمرا لاہور آرٹس کونسل میں پیش ہونے والے کھیلوں میں یہ کھیل اپنے موضوعاتی،فکری اورلسانی کے حوالے سے بہت انفرادیت رکھتا ہے کیونکہ ڈرامہ نگار نے جہاں بدلتی ہوئی تہذیب کےعمل کوپیش کیا وہاں زبان کی تبدیلی کےعمل کوبھی پیش کیا ہے۔یہ کھیل لسانیاتی اور

موضوعاتی حوالے سے اُردو سٹیج ڈرامے کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔

انتظار حسین کا دوسرا کھیل بھنور ہے۔جو ابسن (Henrik Ibsen) کے کھیل ''The Wild Duck'' سے ماخوذ ہے۔ابسن نارویجن جدید ڈرامہ نگار، شاعر اور ڈائریکٹر تھا۔وہ ۲۰ مارچ ۱۸۲۸ء میں پیدا ہوا اور ۲۳ مئی ۱۹۰۶ء میں وفات پائی۔اس کا شمار تھیٹر میں جدتیں پیدا کرنے والے بانیوں میں ہوتا ہے۔ابسن کو ڈرامہ نگاری میں حقیقت نگاری کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔یورپ میں شیکسپیئر کے بعد اسے بلند مقام حاصل ہے۔انیسویں صدی میں ابسن نے بہت مقبولیت پائی۔اس کا کھیل ''گڑیا کا گھر'' بیسویں صدی میں دنیا بھر میں مقبول ہوا۔ (۵)

میرے پیش نظر انتظار حسین کے ہاتھ کا لکھا ہوا جہازی سائز کے ۸۹ صفحات پر مشتمل سکرپٹ ہے۔ جو مئی ۱۹۹۳ء میں سلمان شاہد (۱۰ جنوری ۱۹۵۲ء) کی ہدایات میں الحمرا لاہور آرٹس کونسل میں پیش کیا گیا۔یہ کھیل چار ایکٹ پر مشتمل ہے۔اس کھیل میں کل آٹھ کردار سیٹھ، جاوید (سیٹھ کا بیٹا)، مراد علی (سیٹھ کا دوست)، اطہر (مراد کا بیٹا)، پروفیسر، ڈاکٹر، نجمہ (اطہر کی بیوی) منی (نجمہ کی بیٹی) اور زرینہ (سیٹھ کی ہونے والی بیوی) شامل ہیں۔

یہ کھیل پانچ مناظر پر مشتمل ہے۔پہلے اور چوتھے منظر میں شام کا وقت ہے۔دوسرے اور پانچواں منظر میں رات کا اور تیسرا منظر صبح کا وقت پیش ہوا ہے۔اس طرح اس کھیل کی کہانی تقریباً ۳۶ گھنٹوں پر مشتمل ہے۔کھیل کا پلاٹ مخلوط ہے۔جس میں کچھ واقعات پہلے ہو چکے ہیں لیکن ان کی تفصیلات کا بعد میں علم ہوتا ہے۔ڈرامہ نگار نے کرداروں کے داخلی اور خارجی تصادم کو بڑی مہارت سے ابھارا ہے۔جاوید کا اپنے باپ (سیٹھ) سے تصادم ہے۔کیونکہ اپنی مرحوم والد کی موت کا ذمہ دار اپنے کو سمجھتا ہے۔سیٹھ نے اپنی پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری خواتین سے ناجائز تعلقات بنائے، اس وجہ سے سیٹھ کی پہلی بیوی اور بیٹا اس کی شفقت سے محروم رہے۔جاوید اپنی یہی نفرت اطہر میں بھر دیتا ہے۔اطہر کا اپنی بیوی، سیٹھ اور بیٹی سے تصادم ہے۔

خارجی تصادم کے علاوہ یہ سب کردار بری طرح داخلی تصادم کا شکار بھی ہیں ۔ ہر کردار اپنے کسی نہ کسی ذہنی کرب میں مبتلا ہے ۔ڈرامہ نگار نے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کرب کو دور کرنے کے لیے قربانی کا راستہ اختیار کیا ہے ۔انتظار حسین کے کھیل ''بھنور'' میں قربانی کی مختلف صورتوں کو پیش کرتے ہوئے کرداروں کو روحانی سکون پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ جب نفسیاتی امراض بڑھ جائیں تو بعض افراد جرم کا راستہ اختیار کرتے ہوئے وحشت اور درندگی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ۔نفسیاتی امراض کے تحت ہونے والے مختلف جرائم ،جن میں قتل یا خودکشی جیسا ناقابل معافی جرم بھی شامل ہے ۔جیسے منی اپنی جان قربان (خودکشی) کر دیتی ہے۔ جس سے اطہر کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں بیٹی کی محبت غالب آ جاتی ہے حالانکہ وہ اس کی بیٹی نہیں بلکہ سیٹھ کی ناجائز اولاد ہے لیکن اس کی پرورش اطہر نے کی ہے۔

اس کھیل کا پلاٹ یوں ہے کہ سیٹھ اور مراد علی دونوں اکھٹے بزنس کرتے تھے۔سیٹھ نے فراڈ کر کے سارا بزنس خود سنبھال لیا اور مراد علی کے حصے میں صرف غربت آئی ۔سیٹھ کا ایک بیٹا جاوید ہے۔جو ۱۵ سال سے ناراض ہو کر سیٹھ کے گھر سے نکل گیا تھا۔پندرہ سال بعد واپس آ کر اپنے دوست اطہر سے ملتا ہے۔اطہر اسے بتاتا ہے کہ سیٹھ تو بہت اچھا آدمی ہے۔اس نے اپنی سیکرٹری نجمہ سے میری شادی کرا دی ہے اور میری ایک بیٹی بھی ہے ۔ جاوید بہت حیران ہوتا ہے۔جاوید کو یقین نہیں آتا کہ اس کا باپ ایسا نیک کام کرے گا کیونکہ سیٹھ کے تو نجمہ کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔جب سیٹھ سے جاوید کی ملاقات ہوتی ہے تو وہ بتاتا ہے کہ گھر میں ایک پارٹی ہو رہی ہے ۔جو تمھاری آمد پر رکھی گئی ہے ۔پھر اسے بتاتا ہے کہ میں اپنی نئی سیکرٹری زرینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اجازت دو ہو تو میں شادی کر لیتا ہوں ۔ جاوید اجازت دے دیتا ہے۔

جاوید گھر کی دعوت سے جلد ہی بیزار ہو کر اطہر کے گھر میں آ جاتا ہے ۔جہاں اس کی ملاقات نجمہ، اطہر، نجمہ کی بیٹی اور اطہر کے باپ مراد علی سے ہوتی ہے ۔مراد علی ریٹائرڈ میجر

ہے۔ جو شکار کا بہت شوقین ہے۔ مراد علی نے گھر میں پرندے اور جانور رکھے ہوئے ہیں۔ جو اس کی کل کائنات ہے۔ اطہر فوٹو گرافر ہے۔ گھر کا ہی ایک کمرہ سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جاوید اطہر کو بتاتا ہے کہ میں اپنے گھر میں نہیں جانا چاہتا ہے کیونکہ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ میں اپنے ''فراڈ باپ'' کے ساتھ رہوں یا اس کی کوئی بھی چیز استعمال کروں۔ نجمہ اور اطہر اسے سمجھاتے ہیں کہ یہ بد دماغی کی باتیں نہ کرو۔ بہر حال جاوید کرائے پر ایک کمرہ اطہر کے گھر میں ہی لے کر ان کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ نجمہ کی بیٹی منی جاوید کو ایک مرغابی دکھاتی ہے۔ جس سے وہ بہت پیار کرتی ہے۔ مراد علی اس مرغابی کے بارے میں بتاتا ہے یہ سیٹھ غنی کی طرف سے ملی ہے۔

جاوید اپنے دوست اطہر کے گھر میں آ کر بھی خوش نہیں ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے کسی داخلی کرب کی وجہ سے بیزار اور پریشان ہے۔ جاوید اپنے کمرے سے نکل کر اطہر کے پاس آ جاتا ہے۔ پھر دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ اس دوران جاوید اسے بتاتا ہے کہ نجمہ اور سیٹھ کے ناجائز تعلقات تھے۔ جس کے نتیجے میں بیٹی (منی) پیدا ہوئی۔ اس لیے اب سیٹھ اس گھر پر مہربان ہے اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس گھر کی مالی امداد کرتا رہتا ہے۔ تاکہ اس کی بچی کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

اطہر واپس گھر آتا ہے تو ہنگامہ کھڑا کر دیتا ہے۔ نجمہ سے لڑتا جھگڑتا ہے اور منی کو اپنی بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر ناراض ہو کر گھر سے نکل جاتا ہے۔ ادھر جاوید بھی واپس آ جاتا ہے اور ڈاکٹر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ ڈاکٹر بھی اسی گھر کا کرایہ دار ہے۔ ڈاکٹر بتاتا ہے کہ مراد علی ذہنی مریض ہے اور میں اس کا علاج کر رہا ہوں۔ اس نے گھر میں جنگل بنایا ہوا ہے۔ یہیں شکار کر کے اپنے آپ کو خوش کر لیتا ہے۔ اطہر کے حوالے سے بتاتا ہے یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس طرح اطہر کا گھر برباد ہو جائے گا۔ جاوید کہتا ہے کہ میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اطہر ایک نئے ازدواجی رشتے کی بنیاد رکھے تاکہ اس کا ضمیر پرسکون رہے۔ پھر جاوید کی ملاقات منی سے ہوتی ہے۔ جاوید، منی سے کہتا ہے اگر تم اپنے باپ کو خوش کرنا چاہتی ہو تو اپنی سب سے پیاری

چیز مرغابی قربان کر دو۔ کیونکہ یہ سیٹھ غنی سے ملی ہے اور اطہر کو سیٹھ کی طرف سے ملی ہوئی ہر چیز سے نفرت ہے۔ منی احاطہ میں جاتی ہے اور پستول سے خود کو ہلاک کر لیتی ہے۔ جب اطہر کو پتا چلتا ہے تو وہ بیٹی کی محبت میں پاگل ہو جاتا ہے اور اس کی لاش احاطے سے اٹھا کر اندر لے آتا ہے۔ اطہر ڈاکٹر سے کہتا ہے کہ اس ننھی جان کی قربانی نے میرے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر بتاتا ہے کہ موت کو دیکھ کر کچھ لوگوں کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ اطہر کا ضمیر بھی بیدار ہو گیا ہے۔ اب وہ ایک نارمل زندگی گزارے گا اور منی کی موت آہستہ آہستہ اس کی بھولی بسری یاد بن جائے گی۔

انتظار حسین کا شمار اُردو ادب کے بڑے تخلیق کاروں میں ہوتا ہے۔ اس کھیل میں ان کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ کردار نگاری بہت جاندار ہے۔ تمام کردار ایک داخلی کرب میں مبتلا ہیں۔ بظاہر چلتے پھرتے باتیں کرتے، کھاتے پیتے مگر اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ذہنی مریض ہیں۔ سب کردار جھوٹے رشتوں کو جوڑے ہوئے ہیں۔ کرداروں کے آپس میں جھوٹے رشتوں کے علاوہ جانداروں اور دیگر اشیا سے بھی جھوٹے رشتے ہیں۔ کھیل کا مرکزی کردار جاوید ان جھوٹے رشتوں کو ختم کر کے زندگی کی بنیادیں سچے رشتوں پر رکھنا چاہتا ہے۔ مراد علی جوانی میں شکاری تھا۔ بڑھاپے میں شکار کا شوق پورا کرنے کے لیے وہ ایک زخمی مرغابی کو گھر لے آتا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ یہاں انتظار حسین نے اپنے ہجرت کے تجربے کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً مراد علی اور اطہر کی درمیان مرغابی کے حوالے سے ہونے والے کچھ مکالمے ملاحظہ کیجیے:

اطہر: اور آپ کے مہمان کا کیا حال رہا۔

مراد علی: (خوش ہو کر) ہاں ہاں۔ اب ٹھیک ہے۔ اپنے نئے گھر میں مانوس ہو گئی ہے۔

اطہر: اچھا؟

مراد علی: ہاں ابھی میں نے جھانک کر دیکھا۔ اپنے خانے میں ہے۔ مزے سے بسیرے میں

ہے۔میں نے کہا تھا نا کہ نئی جگہ ہے۔اس لیے بے آرام ہے۔رفتہ رفتہ مانوس ہو جائے گی۔
مگر ابھی تھوڑا اور بندوبست کرنا پڑے گا۔(۵)

مرادعلی کی جوانی جنگلوں میں شکار کھیلتے گزری۔اسے اپنے ماضی سے بہت پیار ہے گا ہے بگاہے وہ اپنے ماضی کو کو یاد کرتا رہتا ہے۔وقت کے نشیب وفراز نے اسے مفلوج اور اپاہج کر دیا ہے۔ لیکن وہ اپنے ماضی کو اپنے دل اور دماغ میں زندہ رکھے ہوئے۔ماضی کی اس کھوج میں جاوید بھی لگا رہتا ہے۔مرادعلی سے ملاقات پر جاوید اسے ماضی کی یادوں میں یوں لے جاتا ہے۔مثلاً:

جاوید: (قریب جا کر سلام کرتا ہے) انکل میں آپ کے لیے پیغام لے کر آیا ہوں۔

مرادعلی: پیغام۔کیسا پیغام۔کس کی طرف سے؟

جاوید: آپ کی چھوڑی ہوئی شکار گاہوں کی طرف سے۔ہزارہ کی شکار گاہیں آپ کو یاد کرتی ہیں۔

مرادعلی: (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں بیٹا، اپنا وہ بھی زمانہ تھا۔میں نے اس علاقے کا ایک ایک چپہ دیکھا ہے۔سارے جنگل کھنگال ڈالے تھے۔بہت شکار کھیلا ہے وہاں (رُک کر) میں نے وہاں شیر کا بھی شکار کیا ہے۔ایک مرتبہ ایک ریچھ میری زد میں آ گیا۔بہت شکار کھیلا ہے۔کیا حال ہے ان جنگلوں کا۔

جاوید: جنگل اب اتنے گھنے نہیں رہے۔آپ کو یاد ہو گا میں نے ایک مرتبہ آپ کے وہاں ہوتے ہوئے بسیرا کیا تھا۔آپ کے ساتھ شکار پہ گیا تھا۔کیسا گھنا جنگل تھا جیسے رات ہو گئی ہو۔اب وہ جنگل اتنا گھنا نہیں رہا۔

مرادعلی: یہ کیسے ہوا؟

جاوید: درخت بہت کٹ گئے۔جنگل اب چھدرے چھدرے نظر آتے ہیں۔

مرادعلی: درخت کٹ گئے (تشویش سے) یہ بہت غلط کام ہوا۔خطرناک جنگل اپنا انتقام لیتے ہیں۔

جاوید: ہاں یہ اچھا نہیں ہوا (رُک کر) انکل آپ کیسے گزارہ کرتے ہیں۔اس فضا میں آپ کا دم

نہیں اُلٹتا۔ بور نہیں ہوتے آپ۔

مراد علی: (تعجب سے) کیوں۔ کیسی فضا ہے یہ؟

جاوید: میرا مطلب ہے آپ نے آزادانہ ماحول میں زندگی گزاری ہے۔ جنگل، کھلی فضا، ٹھنڈی تازہ ہوا، اور شکار ہرن، نیل گائے، بارہ سنگھا، تیتر، قاز، مرغابی ــــــ۔ (۷)

جاوید ایک طرف ماضی کی باتوں میں لگا ہے دوسری طرف نئے آبادیاتی نظام کے تحت سبز جنگلوں کے گھنے درختوں کے کٹ جانے پر اظہار افسوس کر رہا ہے۔ شہر ترقی کرتے گئے لوگوں نے شہروں کی طرف ہجرت کی اور شہر کی آبادیاں پھیلنے لگی۔ جنگل کٹنے لگے۔ درختوں کے ساتھ چرند پرند بھی مرنے لگے۔ یہاں انتظار حسین اپنے عہد کی خارجی تبدیلیوں کے ذہنی اثرات کو محسوس کرتے ہوئے تبدیلی کے عمل کو بیان کرتے ہیں۔

جاوید مراد علی کا نفسیاتی علاج کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جاوید اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اور روحانی سکون پانے کے اذیت، کرب اور قربانی ضروری ہے۔ جاوید بار بار اپنے کسی خفیہ پروجیکٹ کی بات کرتا ہے۔ اس کا پروجیکٹ یہی ہے کہ وہ خود ذہنی اور روحانی سکون چاہتا ہے اور دوسروں کو یہ سکون دینا چاہتا ہے۔ جاوید کے نزدیک معاشرے کے تمام افراد ضمیر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ لیکن جب تک ضمیر کی آواز پر لبیک نہ کہا جائے زندگی میں سکون نہیں ملتا۔ جاوید چاہتا ہے کہ لوگوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرے۔ جاوید پندرہ سال بعد اطہر سے ملاقات کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا ضمیر بھی سویا ہوا ہے۔ اطہر ایک مردہ زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اطہر کے ضمیر کو بیدار کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ جاوید کی باتیں سننے کے بعد اطہر کے رویے میں ایک دم تبدیلی آ جاتی ہے۔ وہ سیٹھ سے ملنے والی ہر چیز سے انکار کر دیتا ہے۔ اپنے گھر میں سیٹھ جیسے بد کردار شخص کا ذکر تک نہیں سننا چاہتا ہے۔ اسے اپنی بیوی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی معصوم بیٹی کو اپنانے سے بھی انکار کر دیتا ہے کیونکہ اصل میں یہ سیٹھ کی بیٹی ہے لیکن پرورش اطہر نے کی ہے۔ بیٹی کو کچھ معلوم نہیں ہے۔ وہ تو اطہر کو ہی اپنا باپ تسلیم

کرتی ہے اوراس کی خوشی کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دیتی ہے۔ یہ قربانی اطہر کے اندر چھپی ہوئی بیوی اور بیٹی کی محبت کو پھر سے بیدار کر دیتی ہے۔ پھر اطہر بیوی اور بیٹی سے والہانہ محبت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سچی محبت ہے جس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے کوئی غرض کوئی مطلب نہیں بے لوث محبت ہے۔

اس کھیل کا ایک ثانوی کردار زرینہ بڑی سمجھدار خاتون ہے۔ وہ سیٹھ سے شادی کرنا چاہتی ہے کیونکہ سیٹھ اب بوڑھا ہو گیا ہے اور جلد مر جائے گا۔ زرینہ اس کی دولت پر قبضہ کر لے گی۔لیکن زرینہ نے سیٹھ کو اپنے بارے میں سب صاف صاف بتا دیا کہ میں پہلے کس کس سے وابستہ رہی ہوں۔ سیٹھ اس کے بارے میں سب جانتا ہے۔ اس سچائی کی وجہ سے زرینہ اپنی نئی زندگی کے آغاز پر خوش اور مطمئن ہے۔ اس کا ضمیر مطمئن ہے۔ کھیل میں کرداروں کے مکالمات ٹھوس اور بہت جامع ہونے کے ساتھ، سہ معنی اور فلسفیانہ ہیں۔مگر انداز بیان اور اسلوب میں الجھاؤ نہیں ہے۔ نہ وحدت تاثر میں کمی آتی ہے۔

کھیل کے پانچوں منظر ایک ہی سیٹ پر پیش ہوئے۔ اطہر کے گھر کا سیٹ ہے۔ یہ ایک بڑا کمرہ ہے۔ جس کے ایک کوشے میں سٹینڈ پر لائٹس اور سٹل کیمرہ لگا ہوا ہے۔ اِدھر اُدھر ایسا سامان بکھرا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی سٹوڈیو کا کمرہ ہے۔ کمرے میں ایک طرف صوفہ، کرسیاں اور میز پر کچھ تصویریں، نیگٹو، قینچی اور چھوٹی چھوٹی چیزیں پڑی ہیں۔ یہی کمرہ ڈائینگ روم بھی کے طور استعمال ہوا ہے۔ کمرے کے عقب میں ایک دروازہ احاطہ میں کھلتا ہے۔ جہاں سے کبھی کبھی پرندوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کمرے کے دائیں بائیں دو دروازے نظر آتے ہیں۔ ایک دروازہ سامنے برآمدے میں کھلتا ہے۔ باہر سے آنے والے کردار یہی دروازہ استعمال کرتے ہیں۔ اس دروازے پر گھنٹی بھی لگی ہے۔ ہر منظر پر اسی کمرے کا تھوڑا سا تبدیل کر لیا جاتا ہے لیکن ہر منظر میں یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کمرہ اسٹوڈیو بھی ہے اور ڈائینگ روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ ایک جامع سکرپٹ ہے۔ الحمرا لاہور آرٹس کونسل کے اُردو سٹیج ڈراموں کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ کھیل فنی وفکری اعتبار سے اس قدر پختہ اور جامع ہے کہ ماخوذ ڈراموں کے حوالے سے ہمیشہ اُردو سٹیج ڈرامے کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔

انتظار حسین کے ان ڈراموں میں مرد کردار جدید دور کے انسانوں کی زندگی کے المیے لیے ہوئے سامنے آتے ہیں جو جدید دور میں اپنے عہد کے مختلف تہذیبی اور تاریخی المیوں کا شکار ہیں جس سے ان کے داخلی کرب، نفسیاتی اذیتوں اور ذہنی الجھنوں میں پھنسے ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ انتظار حسین کے ان کرداروں میں ہجرت کے تجربات تخلیقی سطح پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے کھیل ''بھنور'' میں اگرچہ ذہنی سکون کے لیے قربانی کا رستہ پیش ہوا ہے لیکن یہاں بھی جگہ جگہ ہجرت کے اثرات نظر آتے ہیں کبھی مرغابی کے نئے گھر کی صورت میں اور کبھی ہجرت کی قربانی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ کردار ہجرت سے پیدا ہونے والے تہذیبی اور ذہنی المیے بیان کرنے کے لیے ''نیا گھر'' میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہ کردار ایک طرف اس تہذیب سے وابستہ ہیں جو تہذیب دم توڑ رہی ہے، اس تہذیب سے وابستہ کرداروں میں روایات، رسومات اور عقائد کے ٹوٹنے سے ایک کرب دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف یہ کردار نئی جگہوں، نئی اشیا اور نئے عقائد و روایات سے خوف زدہ ہیں۔ یہ کردار بار بار اپنے ماضی کی طرف بھاگتے نظر آتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ محمد کامل نے اپنے مضمون ''اُردو میں ریڈیو ڈراما، آغاز وارتقاء''، مشمولہ: اُردو ریسرچ جنرل، (نئی دہلی: یکم جولائی ۲۰۱۵ء) میں صفحہ ۲۴ پر لکھا ہے کہ: ''انتظار حسین آل انڈیا ریڈیو لکھنو سے وابستہ ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے۔ ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ دل سے قریب ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے ریڈیو ڈراموں میں خرد کا نام جنوں اور سائبان کے نیچے بہت مقبول ہوئے۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی شائع کردہ کتب میں اس عنوان کے تحت انتظار کی کوئی کتاب شائع

نہیں ہوئی۔

۲۔ انتظار حسین کا تذکرہ نیا گھر کے عنوان سے سنگ میل لاہور نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ مذکورہ کھیل اسی تذکرے کی ابتدائی کڑی ہے۔

۳۔ انتظار حسین، نیا گھر، قلمی مسودہ، (لاہور: مخزونہ الحمرا لاہور آرٹس کونسل لائبریری، ۲۴ مئی ۱۹۷۵ء)، ص:۴۵۔

۴۔ انتظار حسین نے اپنے اس سکرپٹ کے صفحہ نمبر ۲۷ پر بشیرن کا ایک مکالمہ کچے گھر والی کے حوالے سے یوں لکھا ''میں اس حرامی کو خوب جانتی ہوں'' الحمرا آرٹس کونسل لاہور کی سکرپٹ کمیٹی نے اس پر دائرہ لگا دیا اور لکھا ''Typul'' یعنی اسے تبدیل کریں، آپ یہ نہیں لکھ سکتے۔

۵۔ ابسن کے حوالے سے درج معلومات اس ویب سائٹ سے گئی ہیں (۲۰۱۶۔۱۰۔۲۹):

http://en.wikipedia.org/wiki/Henrik_Ibsen

۶۔ انتظار حسین، قلمی مسودہ؛ بھنور (لاہور: مخزونہ؛ الحمرا لاہور آرٹس کونسل لائبریری، مئی ۱۹۹۳ء)، ص:۱۶۔

۷۔ انتظار حسین، قلمی مسودہ۔، بھنور، ص:۲۲

متن ڈرامہ

نیا گھر

از

انتظار حسین

نجمہ آرٹ سوسائٹی

نیا گھر

No:110

24/5/75

تحریر: انتظار حسین

(کردار جس ترتیب سے سٹیج پر آتے ہیں)

شمیم (انجمن):

زاہد (انور علی): شمیم کا چھوٹا بھائی

ماجد: شمیم کا منجھلا بھائی

ممّی (عطیہ شرف): شمیم کی ماں جسے برادری والیاں ''نیم والی آپا'' کہتی ہیں۔

بشیرن: برادری کی ایک عورت

تحصیلدارنی: برادری کی دوسری عورت

ڈیڈی: (کمال احمد رضوی) شمیم، ماجد اور زاہد کا باپ

کچے گھر والی (ناہید): برادری کی تیسری عورت

24/5/75

پہلا ایکٹ

[ایک کمرہ جس کی تعمیر بتاتی ہے کہ وہ کسی نئی طرز کی کوٹھی کا ڈرائنگ رُوم ہے۔ اس کمرے میں سامان بے ترتیبی سے پڑا ہے۔ کچھ کھلا پڑا ہے کچھ اَدھ کھُلا۔ کچھ سیدھا رکھا ہے کچھ بالکل نئی کرسیاں کچھ پرانے مونڈھے ایک خستہ حال چار پائی ایک طرف پڑی ہے کچھ ٹوکریاں۔ کچھ بکھری ہوئی کتابیں۔ ایک لڑکی شمیم نام کی لباس معمولی شلوار قمیض اور دوپٹہ۔ لباس کسی قدر میلا والا ہے۔ بے کنگھی بالوں کی ایک لَٹ مُنہ پر آ پڑی ہے۔ نہایت تندہی سے سامان درست کرنے میں مصروف ہے۔ ایک لڑکا عمر یہی کوئی دس برس، چُست، نیلی پتلون گھٹنوں سے اونچی۔ گہرے سُرخ زنگ کی چارخانے دار قمیض نام زاہد۔ شمیم کے ساتھ مل کر سامان اٹھا رہا ہے اور قرینے سے رکھ رہا ہے۔ کمرے میں دو دروازے ہیں۔ دایاں دروازہ اندر کے کمروں کو کھُلتا ہے بایاں دروازہ باہر کھُلتا ہے۔]

شمیم: (کُرسی اٹھا کر ایک طرف سلیقے سے رکھتے ہوئے زاہد سے مخاطب ہوتی ہے) وہ کُرسی بھی اس کے برابر رکھو۔

زاہد: (دوسری کرسی برابر رکھتے ہوئے) باجی! اب ہم یہاں رہا کریں گے۔

شمیم: (دونوں کرسیوں کو قریب قریب کرتے ہوئے) ہاں۔

زاہد: نیم والے گھر میں اب ہم نہیں جائیں گے۔؟

شمیم: نہیں۔

[ایک نوجوان تھری پیس سُوٹ پہنے عینک لگائے سگریٹ پیتا دائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ شمیم اور زاہد کو کرسیاں درست کرتے ہوئے خاموشی سے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کا نام ماجد ہے۔ زاہد چار پائی کو گھسیٹ کر سٹیج کے وسط میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔]

ماجد: چار پائی اندر جائے گی۔

زاہد: مگر اماں جی کہہ رہی تھیں کہ یہیں بچھے گی۔

ماجد: (غصیلی نظروں سے اسے گھورتا ہے) اماّں جی کیا ہوتا ہے؟

زاہد: (سہم کر) ممّی کہہ رہی تھیں کہ۔۔۔۔۔۔۔

ماجد: کان پکڑو۔

زاہد: (کان پکڑتا ہے)

ماجد: کہو کہ اب اماّں جی نہیں کہوں گا۔

زاہد: (کان پکڑے پکڑے) اب اماّں جی نہیں کہوں گا۔

ماجد: یہ چار پائی اندر جائے گی۔

[شمیم اور زاہد دونوں چار پائی اٹھاتے ہیں اور دائیں دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ ماجد بڑبڑاتا ہے۔]

ان دقیانوسی چار پائیوں کو بھی کہیں ٹھکانے لگانا پڑے گا۔ کچھ سینگل بیڈ آ جائیں تو ٹھیک رہے گا۔

[ممّی داخل ہوتی ہیں۔ ادھیڑ عمر کی عورت ہیں۔ پرانی قسم کی عورتوں والا حلیہ ہے]

ممّی: بیٹے ماجد! یہ غسل خانے میں ڈھائی گز لمبی کھرل سی کیا رکھی ہے؟

ماجد: (بدمزہ ہو کر) آپ تو کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔ وہ باتھ ٹب ہے۔

ممّی: یہی تو میں کہوں کہ بھلا اتنی بڑی کھرل بھی کہیں ہوتی ہے اور کھرل ہو گی تو غسل خانے

میں کیوں رکھی جائے گی۔(واپس چلی جاتی ہیں)

[شمیم اور زاہد واپس آتے ہیں پھر سامان درست کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں دونوں مل کر میز کو بیچ میں لاتے ہیں۔اور کرسیوں کے سامنے بچھاتے ہیں]

ماجد: کُرسیوں سے بالکل بھڑ گئی ذرا فاصلے سے رکھو۔(شمیم میز سرکاتی ہے)

شمیم: (الگ کھڑے ہو کر دیکھتی ہے)اب ٹھیک ہے۔

ممّی: (پھر داخل ہوتی ہیں) بیٹے ماجد۔غسل خانے میں گھڑونچی تو ہے ہی نہیں۔

ماجد: ممّی نئے باتھ رُوم میں کوئی گھڑونچی وڑونچی نہیں ہوتی۔

ممّی: اے ہے تو پھر گھڑے کہاں رکھے جائیں گے۔؟

ماجد: گھڑے مٹکے یہاں نہیں چلیں گے۔

ممّی: اے لو۔یہ نئی بات کہی گھڑے مٹکے نہیں چلیں گے۔گھڑے نہ بھی رکھے جائیں ایک مٹکا تو رکھا ہی جائے گا۔آخر بچوں کا گھر ہے۔نہانا ہے دھونا ہے۔(بولتے بولتے چلی جاتی ہیں)

[شمیم ایک ٹوکری کھولتی ہے۔جس میں زینت و آرائش کی مختلف چیزیں بھری رکھی ہیں۔انہی میں موہنجوداڑو کی ڈانسنگ گرل ہے۔شمیم اسے نکال کر دیکھتی ہے۔]

شمیم: بھائی جان اسے کہاں رکھا جائے گا؟

ماجد: اسے کارنس پر رکھو(شمیم ڈانسنگ گرل کو کارنس پہ سجا دیتی ہے۔ماجد آ کر اسے مختلف زاویے سے رکھتا ہے پھر دُور ہو کر دیکھتا ہے)۔اب ٹھیک ہے۔کیوں شمیم؟

شمیم: جی۔اب ٹھیک ہے۔(ممّی پر داخل ہوتی ہیں)

ممّی: (فکر بھرے لہجے میں) بیٹے ماجد! آنگن میں نیم نہیں ہے۔

ماجد: (تحیر سے) نیم؟ وہ کس لیے۔

ممّی: اے بیٹا ہرے بھرے نیم سے گھر میں قدرتی روپ رہے اور پھر آخر برسات بھی تو

آنی ہے۔جھولا کہاں پڑے گا؟

ماجد: ممّی یہاں جھولا نہیں چلے گا۔

ممّی: ہےَ۔۔۔ بیٹے کیا برسات نہیں آنے کی جو جھولا نہیں پڑے گا۔او ہاں ابھی تو برسات دور ہے۔اور پھر آنگن میں اتنی لمبی لمبی گھاس کھڑی ہے۔

ماجد: ممی وہ گھاس نہیں ہے لان بنا ہوا ہے۔

ممی: اور کیاری میں نحوست ماری ناگ منی کے گملے رکھے ہیں اسے پھینکواؤ۔

ماجد: ممی وہ ناگ منی نہیں کیکٹس ہے۔

ممی: بیٹے انگریزی سے بُری چیزیں اچھی تو نہیں ہو جاتی وہ تو دوزخ کا پھل ہے۔اللہ بخشے تمہارے دادا ابا نے اسے باغ میں کہیں دیکھ لیا تھا تو مالی کو بلا کر فوراً اکھڑوا دیا۔

ماجد: امریکہ میں تو وہ ڈرائنگ رُوم میں رکھا جاتا ہے۔

ممی: اے بیٹے امریکہ والے تو ہیں ہی دوزخی مگر ہمیں تو دوزخ میں نہیں جانا۔

ماجد: مگر میں نے تو کیکٹس خاص طور پر منگوایا ہے۔

ممی: بیٹے خاص طور پر پہلے چنبیلی کی قلم منگوائی ہوتی۔اور طرح طرح کی پھلواری ہے موتیا، گلاب،گلِ مہندی،گلِ شبو،گلِ بانس،مولسری،ہارسنگھار،چھوئی موئی،ڈوبی نحوست ماری ناگ منی ہی کا تحفہ منگانے کے لیے رہ گیا تھا۔(کارنس کی طرف نظر جا پڑتی ہے۔غور سے دیکھتے ہوئے)ننگی عورت؟زاہد کے بچے یہ تو لایا ہوگا کہیں سے!

زاہد: (سہم کر) بھائی جان لائے ہیں۔

ماجد: ممی یہ موہنجوداروکی ڈانسنگ گرل ہے۔

ممی: بیٹے شرم کر۔گھر میں جوان بہن بیٹھی ہے اور تو ایسی بے حیائی کی مُورتیں لا کے سجا رہا ہے۔

(بشیرن داخل ہوتی ہے ممی کی ہم عمر۔سفید برقعہ پرانی قسم کی عورتوں کا حُلیہ ماجد آہستہ

سے بائیں دروازے سے نکل جاتا ہے۔)

بشیرن: اجی نیم والی آپا۔سلام۔

ممی: اے ہے یہ عید کا چاند آج کدھر سے نکل آیا۔

بشیرن: اجی میں سنا نیم والی آپا کوٹھی میں چلی گئی تو ہیں تو میں نے کہا کہ کوٹھی کی مبارک باد دی (دے) آؤں۔(چاروں طرف دیکھتے ہوئے) یہ کمرہ تو بہت بڑا ہے۔

ممی: کمرے سب بڑے بڑے ہیں اور ہوادار ہیں۔آنگن بھی بہت کھلا ہوا ہے اور بشیرن کیا بتاؤں غسل خانہ تو ایسا ہے جیسے چینی کا بنا ہوا ہو۔

(بشیرن چاروں طرف دیکھتے جارہی ہے) اری بیٹھ تو سہی۔

بشیرن: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) اللہ قسم بڑا اچھا مکان ہے۔

ممی: مکان؟ اے بی بی مکان ایسا ہوتا ہے۔یہ تو کوٹھی ہے۔

بشیرن: اے ہاں کوٹھی۔ڈوبا مکان ہی زبان پہ چڑھا ہوا ہے۔یہ تو پوری کوٹھی ہے۔

ممی: بی بی سچی بات ہے میں تو کوٹھی کے بہت خلاف تھی میں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ میں نیم والے گھر سے نہیں نکلوں گی ۔ تجھے شکر آوے ۔ ماجد اڑ گیا۔ کہنے لگا کہ ممی پوزیشن کا بھی تو خیال کرنا چاہیے۔میں نے کہا کہ بیٹے تو امریکہ سے آیا ہے۔پوزیشن تو تیری ہے ہماری کیا پوزیشن ہوتی ہم تو پاکستان میں پڑے ہیں۔اسی کچے پکے گھر میں کچھ کٹ گئی کچھ کٹ جائے گی۔مگر وہ نہ مانا۔میں نے کہا کہ اچھا بیٹا جو تمھاری خوشی وہ ہماری خوشی۔

بشیرن: اس میں فکر کی کیا بات ہے گھر بدلے ہی جاتے ہیں۔

ممی: مگر نیم والا گھر ہمارا اجداجدی گھر تھا۔ ہمارے تو سب کاج اسی گھر میں ہوئے۔اللہ بخشے عابد ماجد کے دادا ابا کو کہا کرتے تھے ہمارا نیم برکت والا پیڑ ہے اور سچ ہی کہویں تھے۔انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔پونی صدی جیئے اور اس شان سے جیئے

کہ بہت کمایا بہت لٹایا مگر گھر میں رزق کی کبھی بھی تنگی نہیں ہوئی۔ میں نے ماجد سے کہا کہ بیٹے تم تینوں کڑوے نیم سے بڑے ہوا سی نیم والے گھر میں تمہارے باپ نے ہوش سنبھالا اور سرسبز ہوئے ہیں میری گود ہری ہوئی۔یہیں اسی نیم کی چھاؤں میں تم دونوں پلے پڑے اور امریکہ سے ڈگریاں لے کر آئے۔

بشیرن: یہ سچ کہہ تھا وہ برکت والا گھر۔

ممی: بشیرن! ہرا بھرا پیڑ بہت برکت والا ہوئے، اور ہمارے نیم پر تو بزرگوں کا سایہ تھا۔اور عابد ماجد کے دادا ابا نے تو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔فجر کی نماز کے وقت اٹھے تو کیا دیکھا کہ نیم کے نیچے کوئی مصلیٰ پہ بیٹھا ہے سفید براق لباس، سفید نورانی داڑھی اور چاروں طرف نور ہی نور۔

بشیرن: اللہ بخشے تمہارے سسر بھی بڑے اللہ والے تھے ایک دفعہ انھیں بشارت بھی ہوئی تھی۔

ممی: بشارت بھی بس ایسے ہی ہوئی تھی۔اسی نیم کے نیچے۔تو میں نے سنا کہا کہ بیٹے میں نیم والے گھر سے نہیں نکلوں گی۔ مجھے شک آوے۔مگر بھائی آج کل کے لڑکے کہاں مانیں۔ ماجد نے الٹا مجھے باولا بنا دیا۔اور پھر کہنے لگا کہ ممی پوزیشن کا بھی تو خیال کرنا چاہیے۔

بشیرن: ہاں جب اولاد بڑی ہو جاتی ہے تو پھر اُنہی کی خوشی ہوتی ہے۔

ممی: بی بی اس کا کہنا بھی سچا تھا۔موٹر وہاں کہاں کھڑی کرتا۔تمہارا ماجد اتنی لمبی (دونوں باہیں پھیلا کر) موٹر لے کر آیا ہے۔خدا نظر بد سے بچائے جب گلی میں داخل ہوتی تھی تو آدمی کے نکلنے کا رستہ نہیں رہتا تھا۔محلہ والوں کو خدا سمجھے۔انھوں نے آنکھوں دانتوں پر چڑھانا شروع کر دیا۔بشیرن لوگوں سے کسی کی خوشی دیکھی نہیں جاتی۔

بشیرن: نیم والی آپا۔اللہ قسم مجھے تو تمھاری کوٹھی اور موٹر کہ بہت خوشی ہوئی ہے۔وہ اور ہوتے ہوں گے جو دوسروں کی آسودگی دیکھ کے جل بھن جاتے ہیں۔میں تو کنبہ برادری میں

کسی کو پھلتا پھولتا دیکھوں ہوں تو بہت خوش ہوتی ہوں۔ میں نے جب سنا کہ سیم والی آپا کوٹھی میں چلی گئی تو فوراً برقعہ اٹھا کے کھڑی ہوگئی کہ مبارک بادی دی آؤں۔

ممی: اجی مبارک بادی تو اس وقت لوں گی جب عابد ماجد اپنی کوٹھی بنوائیں گے۔

بشیرن: خدا وہ دن بھی جلدی لاوے گا۔ اس کی مبارک بادی اس وقت ہوگی۔

ممی: یہ کوٹھی بہت بھاری کرائے پر لی ہے۔ پچیس اور تین سو کرایہ ہے۔

بشیرن: اجی اب تو تمہارے دو بیٹے کمانے والے ہیں پچیس اور تین سو تو ان کے ہاتھ کا میل ہیں۔ اب تمھاری کوئی چھوٹی (اہمیت) حیثیت تھوڑا ہی ہے۔

ممی: حیثیت کی بات تو بی بی یہ ہے کہ عابد ماجد کے باپ نے بھی ہمیشہ اچھا ہی کمایا تنخواہ تو کم ہی تھی مگر بالائی آمدنی ہمیشہ اچھی رہی۔ ہاں اب پنشن کے ساتھ سوکھی تنخواہ رہ گئی ہے۔

بشیرن: اجی کیا سوکھی کیا گیلی۔ اب تو تنخواہوں میں گذارہ ہی نہیں ہوتا۔ کمانے والے کماتے کماتے تھکے جا رہے ہیں۔ مگر گھروں کے خرچ پورے نہیں ہوتے۔ مہنگائی بہت ہوگئی ہے۔

ممی: یہ تو سچ ہے مگر بی بی ہم نے اسی تنخواہ میں اولاد کو پالا پرورش کیا پڑھایا لکھایا۔ ماشااللہ دونوں اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے ہیں۔ تیسرا ابھی کھڑا ہو جائیگا اور بیٹی کا جہیز بھی اسی تنخواہ میں تیار کیا۔ ہاں اب ذرا یہ بات ہے کہ پنشن ہوگئی ہے (آواز دیتی ہے) شمیم! اری او شمیم کیا کر رہی ہے (شمیم کی آواز دوسرے کمرے سے سنائی دیتی ہے)۔

شمیم: ممی! سامان سنگھار رہی ہوں۔

ممی: اری ذرا مجھے پاندان دے جا۔

شمیم: (دوسرے کمرے سے آواز آتی ہے) ممی جان لائی۔

ممی: (پھر باتوں والے لہجے میں) بس ذرا پنشن کی وجہ سے ہاتھ تنگ ہوگیا ہے۔

بشیرن: خیر اب تمہارے بیٹے کمانے والے ہوگئے ہیں۔

ممی: خیر ابھی تو ایک کمار ہا ہے۔

بشیرن: دوسرا ابھی ماشاللہ ڈگریوں والا ہے وہ بھی کمائے گا۔

ممی: اور بی بی ڈگریئیں بھی امریکہ کی ہیں۔

(دائیں دروازے سے شمیم دونوں ہاتھ میں پاندان سنبھالے داخل ہوتی ہے۔)

شمیم: (پاندان رکھتے ہوئے) بشیرن خالہ آداب!

بشیرن: جیتی رہو بیٹی۔ کڑوے نیم سے بڑی ہو۔ چاند سا دولہا ملے۔

[دولہا کے نام پر چہرے پر تھوڑا حجاب۔۔۔ واپس چلی جاتی ہے]

ممی: بیٹوں کی طرف سے تو میں فارغ ہوں بس (جاتی ہوئی شمیم کی طرف اشارہ کر کے) یہ بوجھ میرے سر پہ ہے۔ یہ کسی طرح ساتھ خوبی کے اُتر جائے تو پھر تو میں فارغ ہوں۔

بشیرن: اللہ چاہے تو ساتھ خوبی ہی کے اُتر جائے گا۔

ممی: بی بی مجھے اور کچھ نہیں چاہیے بس شرافت چاہیے (پاندان کھولنے لگتی ہیں)

بشیرن: شرافت بھی ملے گی اور اللہ چاہے تو اس کے ساتھ باقی خوبیاں بھی ملیں گی۔ اللہ قسم مجھے تو دن رات شمیم کی فکر رہتی ہے اب پہلے سے میں کیا کہوں بس جب وقت آئے گا تب ہی بتاؤں گی۔

ممی: اے ہے اب کہنے میں کیا حرج ہے؟

بشیرن: اجی پہلے سے کہنے میں کیا رکھا ہے۔ بس میں ٹوہ میں ہوں شمیم کے لیے اللہ نے چاہا تو دولہا ایسا لاؤں گی کہ چراغ لے کے ڈھونڈ و تو ویسا دوسرا نہ ملے۔

ممی: (دونوں ہاتھ سے دوپٹہ پھیلا کر) اے اللہ واسطہ رسول کا رسول کی آل کا۔ میری بچی کو ایسا دولہا ملے کہ راج رچائے۔

بشیرن: راج ہی رچائیگا۔ بس تم تیاری کرو۔

ممی: بی بی تیار پوری ہے۔ لڑکے والے نقدی چاہیں تو نقدی موجود ہے۔ جہیز چاہیں تو جہیز

حاضر ہے سارا روپیہ ڈاک خانے میں جمع ہے۔ میں نے عابد ماجد کے باپ سے کہہ دیا ہے کہ اس میں سے تمھیں پھوٹی کوڑی خرچ نہیں کرنے دوں گی۔ سب رقم شمیم کے بیاہ کے لیے ہے بلکہ میں نے ڈاک خانے کی کتاب ہی شمیم کے پاس رکھدی ہے کہ بیٹی یہ تیری امانت ہے تو اسے اپنے پاس رکھ۔

بشیرن: اجی میں تو جانوں کہ جہیز ہی ہونا چاہیے۔ نقدی کا کیا پتہ چلتا ہے۔ ایک مٹھی سے نکلی دوسری مٹھی میں چلی گئی۔ جہیز کو دنیا دیکھتی ہے۔ چاند چڑھے کل عالم دیکھے۔

ممی: تو بشیرن جہیز کی بات یہ ہے کہ کچھ زیور تو میں نے بنوالیا ہے کچھ بنوالوں گی۔ برتنے کی چیزیں بھی خرید لی ہیں اور کچھ سامان عابد امریکہ سے بھیجے گا اور ساڑھیاں میں کراچی سے خریدونگی۔ واں کپڑا اچھا ملتا ہے۔ عابد ماجد کے باپ مہینے دو مہینے میں ہی کراچی جانے والے ہیں۔

[تحصیلدارنی داخل ہوتی ہے بوڑھی خاتون سر کے بال زیادہ سفید ہو چکے ہیں لباس صاف ستھرا، سفید اجلا غرارہ چال ڈھال میں وقار، گفتگو میں متانت ممی دیکھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔]

تحصیلدارنی بُوا میں تو خود آپ کی طرف آنے کا کئی دن سے ارادہ کر رہی تھی مگر مکان بدلنے میں فرصت ہی نہ ملی۔

تحصیلدارنی: (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) مکان تو کشادہ لگتا ہے۔

ممی: ماشااللہ اچھا خاصا کشادہ ہے۔ مکان کیا کوٹھی سمجھو۔

تحصیلدارنی: اچھا کیا بدل لیا۔ کشادہ مکان میں رہنے سے بڑا فرق پڑتا ہے۔ وہ گھر تو بہت تنگ تھا۔

بشیرن: تنگ گھر ہو تو بیاہ شادی کے وقت بہت پریشانی ہوتی ہے۔ اب ماشااللہ بیٹی کا بیاہ سر پہ کھڑا ہے اچھا ہی کیا کہ کوٹھی میں آ گئیں۔

[تحصیلدارنی ایک بے تعلقی کے ساتھ خاموش رہتی ہے۔ممی پان بنانے میں مصروف رہتی ہے بشیرن وقفہ کے بعد پھر بولتی ہے]

نیم والی آپا۔ بیٹوں کی شادی تو کرتی رہنا۔مگر بیٹی سے جلدی نبٹ جاؤ۔(وقفہ) کیوں تحصیلدارنی بُوا۔ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔

تحصیلدارنی: (متانت سے) بی بی۔ میں کسی کے شادی بیاہ کی بات میں نہیں بولتی۔ یہاں تو بات بات پر زبان پکڑی جاتی ہے۔

بشیرن: اجی اس میں زبان پکڑے جانے کی کیا بات ہے؟

تحصیلدارنی: یہی تو بات ہے کہ بات کچھ بھی نہیں بس بے بات کی بات بن جاتی ہے اور زبان پکڑی جاتی ہے (کسی قدر تیز لہجہ میں) بھئی میں اسی لیے پردیس میں منہ چھپائے پڑی تھی۔تحصیلدار صاحب کو چھٹی ملتی بھی تھی تو میں کہتی تھی کہ جہاں پڑے ہیں وہیں پڑے رہیں دیس جا کے کون بوٹیاں نوچوائے ۔ ایک کی سو سو بنتی ہیں پھر تحصیلدار صاحب کی پنشن ہوگئی۔ میں تو اس وقت بھی یہی کہا تھا کہ پردیس میں جہاں اتنی گذری وہاں تھوڑی اور گذر جائے مگر تحصیلدار صاحب نہیں مانے۔

ممی: اے ہے تحصیلدارنی بوا۔ یہ تم نے کیا بات کہی؟ پنشن کے بعد تو سب ہی اپنے دیس میں آتے ہیں۔

تحصیلدارنی: بی بی اوّل تو اس زمانے میں پنشن ہوتی ہی نہیں۔ بڑے بڑے افسروں کو تو سرکار چھوڑتی ہی نہیں۔ادھر پنشن دی اور ادھر کسی دوسرے کاج میں لگا دیا۔

ممی: اجی ہم نے تو پہلے ہی دیکھا تھا کہ پنشن لے کے لوگ اللہ اللہ کیا کرتے تھے گھر آ کر مکان بنواتے تھے۔ قضائے عمری ۔۔(کرتے)۔۔۔۔تھے۔ حج پہ چلے جاتے تھے۔ پوتیوں پوتوں کے بیاہ کا بندوبست کرتے تھے۔ اب نیا زمانہ آیا ہے کہ نہ قضائے عمری نہ حج۔ آخر دم تک وہی دنیا کا دھندا۔ ایک نوکری سے پنشن لی۔ اور

دوسری نوکری کر لی۔

تحصیلدارنی: اللہ رکھی تمہارے تحصیلدار صاحب بھی کسی سے چھوٹے افسر نہیں تھے چاہتے تو وہ بھی پھر کوئی بڑی سی افسری کر لیتے۔ بھئی سرکار انھیں روکتی رہ گئی۔ مگر انھوں نے یہی کہا کہ میں بہت تھک گیا ہوں اب اپنے گھر جا کے بیٹھوں گا۔ اور باقی زندگی یادِ الٰہی میں گزاروں گا۔ مگر میں تو یہاں آ کر مشکل میں پھنس گئی۔

ممی: اے ہے مشکل میں پھنسنے کی کیا بات ہے؟

بشیرن: تحصیلدارنی بوا۔ اللہ قسم مجھے تو تمہارے آنے کی بہت خوشی ہوئی ہے۔

تحصیلدارنی: بی بی میں تو یہاں پردیسن ہوں الگ کونے میں پڑی ہوں۔ بیبیاں میرا ذکر کیوں نکالتی ہیں۔

بشیرن: بیبیاں باؤلی ہوگئی ہیں تم نے کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ بھلا تمہارا ذکر کیوں کرتی ہیں۔ آخر وہ کون بی بی تھیں؟

تحصیلدارنی: (غصے سے) بی بی مجھے ایسے چندرا چندرا کے بات تو مت کرو۔ پردیسن ہوں مگر بالکل بے عقل بھی نہیں ہوں۔

بشیرن: (تنک کر) اے ہے تحصیلدارنی بوا۔ میں نے کیا کہا ہے۔ میں تو پوچھ رہی تھی کہ آخر کون بی بی تھیں اور اس نے کیا کہا؟

تحصیلدارنی: (غصے سے) جس بی بی نے میرے بیٹے کا نام لیا ہے اسے میں خوب سمجھتی ہوں۔

بشیرن: (حیران ہو کر) بیٹے کا نام لیا ہے۔ تمہارے بیٹے کا؟ کس کے ساتھ نام لیا ہے۔

تحصیلدارنی: کسی کے ساتھ بھی لیا ہو میں کہتی ہوں کہ کیوں لیا۔ میں کسی کے اچھے برے میں نہیں ہوں پھر کوئی میرا ذکر کیوں کرے۔ اور میرے بیٹے کا نام کیوں لے۔

بشیرن: (تنک کر) تحصیلدارنی بوا صاف بات ہے میری تو یہ عادت ہی نہیں ہے۔ کہ میں کسی کے بیٹے بیٹی کا رشتہ جوڑنے بیٹھ جاؤں تو میری طرف تو تم اشارے مت کرو۔

تحصیلدارنی: اے ہے میں تجھے تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں۔

بشیرن: (غصے سے) اور پھر کسے کہہ رہی ہو؟

تحصیلدارنی: جس نے میرے بیٹے کا نام لیا۔

بشیرن: میں تمہارے بیٹے کا نام کیوں لیتی۔ نام لیا ہوگا کچے گھر والی نے جس کے گھر یہ ذکر ہو رہا تھا۔

تحصیلدارنی: کچے گھر والی کون ہوتی ہے کسی کی لڑکی کے ساتھ میرے لڑکے کا نام لینے والی۔

بشیرن: میں کیا جانوں یہ کچے گھر والی سے پوچھو۔ میں نے تو ایک چلتی سی بات پوچھی تھی کہ تحصیلدارنی بوا کے بیٹے کی عمر اب کیا ہوگی۔

تحصیلدارنی: میں پوچھتی ہوں کہ ہمارا لڑکا کون سا ایسا بڈھا ہو گیا ہے کہ اس کی عمر لکھائی جا رہی ہے۔ لوگوں کے بیٹوں کے عینکیں لگ جاتی ہیں اور ان کا بیاہ نہیں ہوتا۔

ممی: اے ہے تحصیلدارنی بوا یہ تم نے کیا بات کہی۔ بھئی عینک کی تو یہ ہے کہ اب تو لگانے والے لڑکپن میں عینک لگا لیتے ہیں۔

بشیرن: بی بی گھی دودھ دنیا سے اڑ گیا۔ الا بلا کھاتے ہیں عینکیں نہ لگیں تو کیا ہو۔ بلکہ اب تو ایسی آفت ٹوٹی ہے کہ کڑیل جوانوں کے بال سفید ہو جاوے ہیں۔

تحصیدارنی: خیر بی بی مجھے اس سے کیا۔ مگر میرے بیٹے کی عمر کوئی کیوں پوچھے؟

بشیرن: اے ہے میں تو ایک بات چوٹی بن گئی۔ اللہ کرے تمہارے بیٹے کی عمر بڑھے کے پیڑ سے زیادہ ہو۔ اب جو اس کی عمر پوچھوں تو جو چور کا حال وہ میرا حال۔

تحصیلدارنی: بی بی ایک بات صاف صاف کہے دیتی ہوں سب کان کھول کے سن لیں کہ میرے بیٹے کی جو بھی عمر ہو ابھی میں اس کا بیاہ نہیں کروں گی۔

ممی: (تلخ لہجے میں) تحصیلدارنی بوا۔ یہ تم کسے سنا رہی ہو؟

تحصیلدارنی: سب بیٹیوں والیوں کو سنا رہی ہوں۔

ممی: (غصے سے) بیٹیوں والیاں اپنی بیٹیوں کو زبردستی تو کسی کے سر نہیں منڈھتی پھرتی ہیں۔

تحصیلدارنی: اے ہے تو تو اپنی طرف لے گئی۔ میں تو دنیا کا ذکر رہی ہوں۔ اللہ قسم تیری طرف تو میرا بالکل دھیان نہیں تھا۔ اور شمیم تو میری بیٹی کی برابر ہے (ممی خاموشی سے پان لگا کر ایک تحصیلدارنی کو دیتی ہے دوسرا بشیرن کو)۔

بشیرن: (منہ بگاڑ کر) چھالیا گلی ہوئی ہے۔

ممی: کیا کروں؟ بڑی مشکل ہے۔ اچھی چھالیا تو بازار میں مل ہی نہیں رہی۔

(تحصیلدرانی برقعہ سنبھالتے ہوئے کھڑی ہو جاتی ہے)

ممی: اے ہے تحصیلدارنی بوا تم تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تحصیلدارنی: ہاں بی بی تحصیلدار صاحب آ گئے ہوں گے۔ ان کی ایسی بری عادت ہے کہ گھر میں نظر نہ آؤں تو گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں۔

بشیرن: چاؤ بہت کرتے ہیں۔

تحصیلدارنی: چاؤ کیا کرتے ہیں۔ سٹھیا گئے ہیں۔

[تحصیلدارنی برقعہ اطمینان سے اوڑھتی ہے اور نکل جاتی ہے۔]

وقفہ

(ممی خاموش چھالیا کتر رہی ہیں۔ بشیرن پان چبا رہی ہے)

ممی: بھئی تحصیلدارنی بوا تو ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہیں۔ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔

بشیرن: تحصیلداری کا ٹھسا ہے۔

ممی: پنشن کے بعد بھی اتنا ٹھسا۔ خیر ہمیں کیا۔ ہم تو یہ کہویں ہیں کہ اپنا ٹھسا اپنے گھر رکھیں۔

بشیرن: یہ خاندان ہی مغروروں کا ہے۔ تحصیلدارنی کے باپ کچھ کم تھے۔ اللہ بخشے خان بہادری کے غرور میں ٹیس میں رہتے تھے۔ ہمہ شمہ سے بات نہیں کرتے تھے۔

ممی: بیٹی باپ سے بھی بڑھ گئی۔ عرشِ معلیٰ پہ دماغ ہے۔ بیٹے کو عرش کا تارا سمجھ رکھا ہے (سمجھتی ہے)

بشیرن: یہ بیٹا تو بیٹی سے بھی بڑھ کر ہو گیا۔ ذکر تو آخر بیٹیوں کا بھی نکلتا ہے اور وہ تو بیٹا ہے۔

ممی: بی بی بات یہ ہے کہ میرا تو ان کے لونڈے کی طرف دھیان بھی نہیں گیا بھلا مجھ پہ وہ کیوں برس گئیں۔ کسی اور نے کوئی ایسی ویسی بات کہی ہو تو اس کا مجھے پتہ نہیں۔ مگر جس بی بی نے بھی کیا اس نے بھلی بات تو نہیں کی۔ دوسروں کی بیٹیوں کو بھلا یوں بدنام کیا کرتے ہیں۔ مجھے ذرا پتہ چل جائے اس بی بی کا۔

بشیرن: اے نیم والی آپا تم تو تحصیلدارنی سے بھی بڑھ گئیں آخر ایسی بھی کیا۔ جس گھر میں بیری ہوتی ہے اس گھر میں اینٹ بھی آتی ہے۔

ممی: مگر بی بی کتنی اینٹیں آئیں گی اور کب تک آئیں گی۔ بھلا یہ کوئی بات ہوئی کہ جس کا جی چاہتا ہے وہ میری بیٹی کے لیے کچھ کہہ دیتا ہے۔

بشیرن: مگر میں یہ پوچھوں ہوں کہ تحصیلدارنی بوا نے شمیم کو سمجھا کیا ہے۔ اس وقت تو خیر میں چپ ہو گئی۔ اب انھوں نے یہ بات کہی تو میں صاف کہوں گی کہ تحصیلدارنی بوا شمیم کو ایسی ویسی مت سمجھ۔ چراغ لے کے ڈھونڈو گی تو ایسی لڑکی نہیں ملے گی۔

ممی: اجی مجھے کیا ضرورت یہ کہنے کی۔ میری بیٹی کوئی گری پڑی ہے کہ میں تحصیلدارنی کے سر پر چپکوں گی۔

بشیرن: اجی تم تھوڑا ہی کہو گی۔ اگر ہماری لڑکی اچھی ہے تو ہم اس کی تعریف کیوں نہ کریں۔ کیا تحصیلدارنی اپنے بیٹے کی تعریفیں نہیں کرتی۔

ممی: مجھے تو ایسی تعریفیں اچھی نہیں لگتیں اور تحصیلدارنی کے بیٹے میں آخر ایسے کیا لال ٹنکے ہوئے ہیں۔

بشیرن: نیم والی آپا یہ جانے دو۔ میں تو انصاف کی بات کہوں گی۔ لڑکا اچھا ہے پڑھا لکھا ہے۔

سو میں ایک ہے۔ مگر ہماری شمیم بھی سو میں ایک ہے۔ اگر تحصیلدارنی بوا میں عقل ہوتی تو وہ شمیم کو کبھی نہ چھوڑتیں۔

ممی: وہ تو اپنی تحصیلداری کے ٹرّ میں مری جاتی ہیں۔

بشیرن: میں انھیں سمجھاؤں گی۔

ممی: نا بی بی۔ میری بیٹی کا نام مت لیجیو۔ میں تو تحصیلدارنی کے گھر کبھی اپنی بیٹی نہ دوں۔ انھوں نے سمجھا کیا ہے۔

بشیرن: کوئی بات نہیں۔ بیٹے والوں کے مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں مگر میں تحصیلدارنی کا مزاج درست کر دوں گی۔

[اٹھ کھڑی ہوتی ہے برقعہ اوڑھتی ہے اور نکل جاتی ہے۔ موٹر کے ہارن کی آواز۔ موٹر رُکنے کی آواز۔ موٹر کا دروازہ بند ہونے کی آواز۔ ڈیڈی داخل ہوتے ہیں۔ ڈھیلی ڈھالی اچکن۔ سر پر جناح کیپ مختصر سی کھچڑی ڈاڑھی۔ پیچھے پیچھے ماجد سوٹ بوٹ میں ملبوس۔ موٹر کی چابیوں کا گچھا انگلی میں ڈالے گھماتا ہے دوسرے ہاتھ میں بدھ کے سر کا مجسمہ ہے۔ سب سے پیچھے زاہد ہے جو خوش خوش داخل ہوتا ہے اور دوڑ کر ممی سے لپٹ جاتا ہے۔]

زاہد: ممی ہم نے ابا جان کے ساتھ موٹر میں چڈی کی تھی۔

ماجد: (ڈانٹ کر) زاہد۔ (زاہد سہم جاتا ہے۔ وقفہ) کیا کہا تم نے؟

زاہد: ڈیڈی۔

ماجد: کان پکڑو۔ (زاہد کان پکڑتا ہے) آئندہ کیا کہو گے؟

زاہد: ڈیڈی۔

ماجد: رائٹ۔ (کارنس کی طرف بڑھتا ہے اور بدھ کے سر کا مجسمہ سجا دیتا ہے)

ممی: (غور سے دیکھتے ہوئے) یہ کیا ہے؟

ماجد: Buddhas head

ممی: بیٹے اب تو گھر میں بت لا کے سجائے گا۔ ماں باپ کی عبادت کا تو کچھ لحاظ کیا ہوا۔

ماجد: ممی یہ بت نہیں ہے۔ یہ تو گندھارا آرٹ ہے۔

ممی: (غصے سے) آگ لگے اس اندھارا گندھارا میں۔ میرے تو نماز روزے پہ پانی پھر جائے گا۔ روز ہندوؤں کی مورتی دیکھا کروں گی۔

ماجد: اُف میں کیسے سمجھاؤں آپ کو ممی۔ بُدھا ہندو نہیں تھا۔

ممی: اور یہ مورتی نہیں ہے؟

ماجد: نہیں۔ ڈیڈی آپ ممی کو سمجھائیں کہ یہ تو آرٹ ہے۔ گندھارا آرٹ۔ پاکستان کا کلچر Heritage

ڈیڈی: ماجد کی ماں۔ ماجد ٹھیک کہتا ہے۔

ماجد: (لجاجت سے) ڈیڈی پلیز۔

ڈیڈی: (حیرت سے) کیا ہوا بیٹے؟

ماجد: یہ آپ کا ماجد کی ماں کہنا کچھ بہت ۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ اچھا نہیں لگتا۔

ڈیڈی: اچھا اچھا ہاں بیگم۔

ممی: (غصے سے) میں بیگم ویگم نہیں ہوں میں صاف کہے دیتی ہوں کہ بت اس گھر میں نہیں رکھے جائیں گے۔

ڈیڈی: (سمجھاتے ہوئے) بیگم تمھیں اس سے کیا۔ جو کچھ بھی ہے۔ ڈرائنگ روم ہی میں رہے گا نا۔ تم یہاں تھوڑا ہی بیٹھا کرو گی۔ یہاں ماجد کے دوست بیٹھا کریں گے؟ یہ نئی روشنی کے لوگ ہیں ہمیں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے یہ کہتے ہیں کہ یہ بت پرستی نہیں آرٹ ہے۔ ہو گا۔ ان کا دین ایمان جانے۔

ممی: (بڑبڑاتی ہیں) اچھی نئی روشنی ہے۔

ڈیڈی: اب ماجد میاں نے نئی فرمائش کر ڈالی ہے۔

ممی: (چونک کر) کیا؟

ڈیڈی: ڈائنگ ٹیبل کی خریداری کا منصوبہ ہے۔

ممی: (سٹپٹا کر) کاہے کی خریداری۔

ڈیڈی: کھانے کی میز کی۔

ممی: (حیرت سے) کھانے کی میز۔

ڈیڈی: ہاں کھانے کی میز۔ مطلب یہ ہے کہ اب میز کرسی پر کھانا کھایا جائے گا۔

ممی: (ماجد کو دیکھتے ہوئے) میز کرسی پہ کھانا۔ بیٹے ہوش کی دوا لے۔

ماجد: ممی میرا مطلب یہ ہے کہ آخر جب کوٹھی میں ڈائننگ روم موجود ہے اور اچھا خاصا بڑا ڈائننگ روم ہے تو ڈائنگ ٹیبل بھی ہونی ہی چاہیے۔ آخر رومال کیا بچھے گا۔

ممی: کیا بچھے۔ دستر خوان بچھے گا۔

ماجد: (تعجب اور حقارت سے) دستر خوان؟

ممی: اے بیٹے اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

ماجد: ممی دستر خوان اب آؤٹ ڈیٹ چیز ہے۔ خیر گھر والوں کا معاملہ ہوتو دستر خوان میں بھی مضائقہ نہیں۔ مگر کوئی ملنے والا بھی تو کھانے پر آ سکتا ہے۔ دوسروں کے سامنے تو پوزیشن کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔

ممی: بیٹے میں نے تو تیری پوزیشن ہی کی خاطر یہ بات کہی تھی۔ نہیں تو مجھے ڈوبی کی کیا ہے۔ میں تو پیڑی پر بیٹھ کے کھاتی ہوں۔ اور تو سالن میٹھا میٹھا لگتا ہے۔

ماجد: ممی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ کچھ تو ہماری پوزیشن کا خیال کریں۔

ممی: بیٹے پوزیشن کی خاطر تو میں نے دستر خوان کا نام لیا تھا مگر تمھیں دستر خوان بھی پسند نہیں اللہ بخشے خان بہادر صاحب ان کی پوزیشن کسی سے کم تھی۔ وائسرائے ان کی ڈیوڑھی پہ

سلام کرنے آتا تھا۔ ہم تو ان کے گھر یہی دیکھا کہ دستر خوان بچھ گیا۔ چھوٹے بڑے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے اور کھانا کھالیا۔

ماجد: (منہ بگاڑتے ہوئے) ممی کس صدی کی باتیں کر رہی ہیں آپ۔

ممی: اے بیٹا ہے تو ہمارے زمانے ہی کی بات۔ مگر ہاں چودھویں صدی اس وقت نہیں آئی تھی۔

ماجد: بہر حال بات یہ ہے کہ میں نے ڈیڈی کو آج فرنیچر کی دکانیں دکھائی ہیں۔ ایک ڈائنگ ٹیبل دیکھی ہے اور ایک صوفہ سیٹ دیکھا ہے بہت اچھا صوفہ سیٹ ہے۔

ممی: بیٹے اوفوں صوفوں کی تو ہماری حیثیت نہیں ہے۔ مونڈھے کرسیاں گھر میں موجود ہیں۔

ماجد: (اکڑ کر) حیثیت کیسے بنیں ہے ہماری پوزیشن کس سے کم ہے۔

ممی: میرا لال سلامت رہے۔ پوزیشن ہماری کسی سے کم کیوں ہوتی۔ مگر بربادی بہت ہو جائے گی۔ اتنا کوٹھی کا کرایہ۔۔۔۔ اتنا۔۔۔۔

ماجد: (بات کاٹتے ہوئے) آجکل تو جس کا ذرا بھی سوشل status ہے۔ اس کے ڈرائنگ روم میں صوفے بہر حال ضرور ہوتے ہیں۔

ڈیڈی: اماں ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جن کا کوئی سوشل status نہیں انھوں نے بھی صوفے گھر میں ڈال رکھے ہیں۔ اللہ رکھا کیا ہے کچہری میں چپڑاسی ہے گھر میں ڈرائنگ روم کیا معنی۔ کوئی چھوٹی موٹی بیٹھک بھی نہیں۔ دو باری میں صوفے بچھا رکھے ہیں۔

ماجد: (سٹپٹا کر) یہ تو خیر زیادتی ہے مگر ڈرائنگ روم میں تو صوفے ہونے ہی چاہئیں۔

ڈیڈی: ہاں یہی تو میں کہہ رہا ہوں مگر تمھاری ماں نہیں سمجھتیں۔

ممی: اجی میں سب سمجھتی ہوں۔ مگر میں یہ پوچھتی ہوں کہ یہ ہزار پانچ سو کا خرچ ہے یا نہیں ہے۔ ہزار پانچسو کہاں سے آئیں گے۔ پنشن میں سے؟

ڈیڈی: پنشن میں تو اتنی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں تو گھر کا روٹی کپڑا ہی چل سکتا ہے۔ اس کے

لیےتو بینک سے رقم نکلوانی پڑے گی۔

ممی: (غصہ سے) اجی تم تو پھر ڈاخانے کا نام لیا۔ میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ ڈاخانے سے ایک کوڑی نہیں نکلے گی۔ وہ سب شمیم کے بیاہ کے لیے ہے۔

ڈیڈی: اگر یہ بات ہےتو پھرتو کوئی خریداری نہیں ہوسکتی۔

ممی: نا میں یہ پوچھوں ہوں کہ سامنے جوان بیٹی ہے کیا اسے گھر میں بٹھائے رکھنا ہے۔

ڈیڈی: اجی تم کہاں کی بات کہاں لے گئیں۔ اور اگر لڑنا ہے تو مجھ سے کیوں لڑتی ہو اپنے صاحبزادے سے لڑو۔ صاحبزادے کا خیال ہے کہ اب جب گھر لے لیا ہےتو اسے Furnish کیا جائے۔

ماجد: اور کیا؟

ممی: مگر بیٹے یہ سوچو کہ ڈاخانے میں تھوڑی سی رقم پڑی ہےاورتمہارے باپ کا ہاتھ ہمیشہ سے چلا ہوا تھا میں نے یہ سوچ کر یہ رقم ڈاخانے میں ڈلوادی تھی کہ آگے بیٹی بیٹھی ہے اسے رخصت کرنا ہے۔کیا تمھیں بہن کو رخصت کرنا نہیں ہے۔

ماجد: بیشک رخصت کرنا ہے۔آخر مجھے سروس کرنی نہیں ہے۔

ممی: (ٹھنڈا سانس بھر کر) اجی بک سروس ملی اور کب بیاہ ہوا۔

ماجد: (اکڑ کر) کیا مطلب؟ مجھے سروس نہیں ملے گی۔ بوجان میرے پاس امریکہ کا ڈپلوما ہے۔سروس دیکھتی رہو اب ملتی ہے۔

ممی: تو بیٹا کھانے کی میز اور صوفے کے لیے بھی اس وقت کا انتظار کرلو۔

ماجد: (خوشامدانہ لہجے میں) ممی جب کوئی ملنے والا آتا ہےتو میں بہت آکورڈ فیل کرتا ہوں ۔آپ کیا سمجھیں اس سے پوزیشن پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

ممی: (ٹھنڈا سانس بھر کر) اچھا بیٹے پوزیشن پر اثر پڑتا ہےتو خیر لو۔

(ماجد ڈیڈی کی طرف دیکھتا ہے)

ڈیڈی: (آواز دیتے ہوئے) شمیم۔ بیٹی شمیم۔ ذرا ادھر آؤ۔

[پچھلے کمرے سے شمیم کی آواز آتی ہے۔ ''آئی ڈیڈی'' پھر پچھلے کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور شمیم داخل ہوتی ہے۔ وہی پہلا والا حلیہ۔ بال کچھ اور زیادہ بگڑ گئے ہیں اور کٹی لٹیں منہ پر آ پڑی ہیں۔]

ڈیڈی: ارے بیٹی تو نے یہ کیا صورت بنائی ہے؟

شمیم: ڈیڈی سارا سامان بکھرا پڑا ہے جما کے رکھ رہی ہوں۔

ڈیڈی: اچھی بیٹی ذرا چیک بک تو لاؤ۔ (شمیم چونکتی ہے پھر ماں کی طرف دیکھتی ہے)

ممی: (درشت لہجے میں) میری طرف کیا دیکھ رہی ہے ان کے پیسے ہیں وہ جو چاہیں کریں۔

[شمیم آہستہ سے اسی دروازے سے چلی جاتی ہے جس سے داخل ہوئی تھی۔ ممی خاموشی سے پاندان کھولتی ہیں اور پان لگانے لگتی ہیں۔]

ڈیڈی: (آہستہ سے) پان مجھے بھی دینا۔

[ممی پان لگا رہی ہیں کہ شمیم پھر داخل ہوتی ہے ہاتھ میں چیک بک، ڈیڈی کو دیتی ہے۔ ممی پان پیش کرتی ہیں۔ ڈیڈی ایک ہاتھ سے چیک بک لے کر دوسرے ہاتھ سے پان لیتے ہیں۔ چیک بک کو دیکھتے دیکھتے منہ میں پان رکھتے ہیں۔ اور ہاتھ ماجد کی طرف بڑھاتے ہیں۔ ماجد پھرتی سے جیب سے پن نکال کر کھولتا ہے اور ڈیڈی کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے۔ ڈیڈی لکھنا شروع کرتے ہیں کہ کچے گھر والی تیزی میں داخل ہوتی ہے میلا سا سفید برقعہ، ادھ میلا لباس عمر میں ممی سے قدرے کم نظر آتی ہے۔]

کچے گھر والی: (بہت تیز لہجے میں) اجی نیم والی آپا میں نے کیا کہا تھا کہ تم نے مجھ پر چٹے طوفان باندھ دیئے۔

ممی: (حیرت سے) میں نے؟ بی بی میں نے تجھے کیا کہا ہے؟

[ڈیڈی اور ماجد کچے گھر والی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ڈیڈی چیک پھاڑ کر چیک بک شمیم کو دیتے ہیں جو واپس اندر چلی جاتی ہے۔ پن ماجد کو دیتے ہیں۔]

ماجد: (پن بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) پھر چلئے ڈیڈی۔ دیر ہو گئی تو بنک بند ہو جائے گا۔ (دونو نکل جاتے ہیں)

کچے گھر والی: (غصے سے) کسی نے تو آخر کچھ کہا ہی ہے۔ کہنے والیوں نے مجھے سمجھا ہی کیا ہے۔ میں ان کی سات پشتوں کو نہیں چھوڑوں گی۔ واہ وا یہ اچھا ڈھنگ نکالا ہے کہ باتیں خود کرتی ہیں اور دوسروں کے نام لگا دیتی ہیں۔

ممی: بی بی کس نے تیرا نام لیا ہے؟

کچے گھر والی: کسی نے تو لیا ہی ہوگا۔

ممی: یہاں تو کسی نے بھی نہیں لیا۔

کچے گھر والی: پھر تحصیلدارنی بوا کے دماغ میں کیڑا ابلبلایا ہوگا کہ وہ مجھ سے لڑنے پہنچ گئیں۔

ممی: تحصیلدارنی بوا کا بیٹا تو چھوئی موئی ہو گیا۔ کوئی اس کا نام نہ لے۔ وہی مثل ہوئی کہ اوچھے کے گھر تیتر باہر رکھوں کہ بھیتر۔

کچے گھر والی: تحصیلدارنی بوا کے بیٹے کا نام میں نے تمہارے سامنے لیا تھا۔

ممی: میرے سامنے تو نہیں لیا تھا بشیرن کے سامنے لیا ہوگا۔ وہی کچھ کہہ رہی تھی۔

کچے گھر والی: بشیرن خالہ تو فتنہ ہیں۔ خود فلتہ لگاتی ہیں پھر الگ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ انھیں نے تو مجھ سے پوچھا تھا کہ تحصیلدارنی بوا کے بیٹے کی پیدائش کب کی ہے مجھے کال کھاتی نے کہیں یہ کہہ دیا کہ تیرہ تیزی کی پیدائش ہے۔ جب خان بہادر صاحب مرے تھے۔ تو ان کے چالیسویں کے چوتھے دن پیدا ہوا تھا۔ پھر پوچھنے لگیں کہ نیم والی آپا کی تو لونڈیا بھی تو اسی برس پیدا ہوئی تھی۔

ممی: (عجلت سے) اے ہے اس برس تو وہ پیٹ میں بھی نہیں آئی تھی۔

کچے گھر والی: یہی تو میں نے کہا تھا کہ وہ تو ڈھائی مہینے کم دو برس چھوٹی ہے۔ جب کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا تب وہ پیٹ میں آئی تھی۔

ممی: مگر میں یہ پوچھوں ہوں کہ تحصیلدرانی بوا کے لونڈے کے ساتھ میری لونڈیا کی عمر کا ذکر کیوں نکلا؟

کچے گھر والی: اجی میں دوسروں کے لونڈوں لونڈیوں کی عمر کا حساب نہیں لگاتی پھرتی۔ بشیرن خالہ کو منگنیاں کرانے کی لت ہے۔ وہی ایسے حساب جوڑتی پھرتی ہیں۔ اور تحصیلدرانی بوا کے لونڈے کے ساتھ تو میں کبھی کسی لونڈیا کا نام نہ لوں۔ وہ تو ایسی بد دماغ ہوئی ہیں کہ کوئی لونڈیا انھیں جچتی نہیں۔ شمیم کا نام آ گیا تو اس میں انھوں نے کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ کہنے لگیں (نقل اتارنے کے لہجے میں) ناک نقشہ تو اچھا ہے مگر ہڈیوں کی مالا ہے۔ ایک ایک پسلی گن لوں۔ میں جانوں کچھ بیمار رہوئے ہے۔

ممی: انھوں نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ میں آج ہی ان کے پاس جاتی ہوں۔ کچے گھر والی تجھے بولنا پڑے گا۔

کچے گھر والی: اجی میری طرف سے تم ابھی چلی چلو۔ میں تو منہ پہ بات کرنے والی آدمی ہوں۔

ممی: (اٹھتے ہوئے) تو چل ابھی۔ میں نے ان کا منہ بند نہ کیا تو وہ میری بیٹی کو دنیا میں بدنام کر دیں گی۔

کچے گھر والی: بشیرن خالہ سے بھی میں آج ہی صاف صاف بات کئے لیتی ہوں۔ نیم والی آپا میں تمھیں بیچ میں ڈالوں گی۔

ممی: شوق سے ڈالیو۔ (برقعہ سنبھالتے ہوئے آواز دیتی ہے) شمیم اری او شمیم۔

[دوسرے کمرے آواز آتی ہے ''آئی ممی''، پھر داخل ہوتی ہے]

شمیم: جی ممی؟

ممی: (چلتے ہوئے) بیٹی میں ابھی آرہی ہوں۔

شمیم: ممی کہاں جارہی ہیں آپ۔

ممی: (دروازے پر پہنچ کر) ابھی آئی۔ ذرااس تحصیلدارنی کا دماغ ٹھیک کرآؤں۔سفید چونڈے کے ساتھ ایسی باتیں کرتی ہے۔غیرت نہیں آتی۔

[دونوں تیزی سے نکل جاتی ہیں۔شمیم سٹیج کے وسط میں حیران کھڑی رہ جاتی ہے]

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

[وہی کمرہ مگر اب فرنش ہو چکا ہے۔فرش پر دری وری پر درمیان میں قالین۔ایک صوفی سیٹ۔کچھ نئے ڈایزئن کی کرسیاں۔کارنس پر موہنجوداروتہذیب کی اِکا دُکا نقلی یادگار۔ڈانسنگ گرل، بیل، مہاتمابدھ کا سر۔ایک سمت میں ریڈیوایک سمت میں ٹیلی ویژن سیٹ اس کے برابر ریڈیوگرام جس پر نور جہاں کا ایک ریکارڈ بج رہا ہے۔ قریب کرسی پر شمیم بیٹھی ہےاور بڑے صوفے پر زاہدٹانگیں پھیلائے ادھ لیٹاادھ بیٹھا ہے۔سخت چست پتلون اوررنگین قمیض پہن رکھی ہے۔

شمیم کالباس سادہ اورصاف ہے۔بال سنورے ہوئے ہیں۔بڑی یکسوئی سے گا نا سن رہی ہے۔اتنے میں پچھلے کمرے کا دروازہ کھلتاہےاور ماجد نائٹ سوٹ اورڈریسنگ گاؤن پہنے، ہاتھ میں انگریزی کا اخبارسگریٹ پیتا ہوا داخل ہوتا ہیاس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔حقارت سے شمیم اور زاہد کو دیکھتا ہوا ریڈیوگرام کی طرف بڑھتا ہے۔]

ماجد: (تحقیر کے لہجے میں) ولگر۔(ریکارڈ بند کردیتا ہے)

زاہد: (احتجاج کے لہجے میں) میں نےنہیں لگایایہ باجی کاtaste ہے۔

ماجد: (شمیم کوغصہ سے دیکھتے ہوئے)اس لڑکی کا taste کبھی درست نہیں ہوگا۔

شمیم: (رونی آواز میں) اتنا اچھا گانا تھا بند کر دیا۔

[ماجد خاموشی سے دوسرا ریکارڈ دیتا ہے اور صوفے پر آ بیٹھتا ہے یہ ایک مغربی دھن ہے اسے سنتے سنتے زاہد کھڑا ہوتا ہے اور ٹوِسٹ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ماجد نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور سگریٹ کے کش لے رہا ہے۔ یکا یک گیلری کے دروازے سے ممی داخل ہوتی ہیں۔ تیور غصہ والے ہیں۔ زاہد پھرتی سے کرسی پر جا بیٹھتا ہے]

ممی: میں بھی کہوں انگریزی باجا کہاں بج رہا ہے (شمیم کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھتے ہوئے) اری تجھے پتہ نہیں ہے کہ یہ باجا کس لیے آیا تھا۔ یہ یہاں کیوں رکھا۔

شمیم: (ماجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) بھائی جان سے پوچھیئے (اچانک ممی کی نظر ٹیلی ویژن پر جا پڑتی ہے)

ممی: (غصہ سے) اور یہ سیر بیس یہاں کیوں آئی ہے؟

شمیم: (دانت کچل کر) یہ زاہد کا بچہ ہے۔

ممی: تونے اسے کیوں ہاتھ لگانے دیا۔ تجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ کس لیے آئی ہے؟ (گیلری والے دروازے سے ڈیڈی داخل ہوتے ہیں)

ڈیڈی: کیا ہوا؟ کیوں یہ شور مچ رہا ہے؟

ممی: (رقت بھری آواز میں) سارے جہیز پر پانی پھر گیا۔

ڈیڈی: (تعجب سے) جہیز پر پانی پھر گیا۔ کیسے پھر گیا؟

ممی: (ریڈیو گرام اور ٹیلی ویژن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) دیکھ لو اپنے بیٹوں کی کارستانی۔ (پاپا ٹیلی ویژن اور ریڈیو گرام کو دیکھتے ہیں پھر ماجد کو دیکھتے ہیں۔ ماجد سگریٹ پیتے اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہے پھر وہ آہستگی سے اٹھ کر ریڈیو گرام بند کرتا ہے اور اپنی جگہ آ کر بیٹھتا ہے)

ماجد: ڈیڈی ہم نے کافی بنوائی ہے۔ آپ بیٹھ جایئے۔ (شمیم سے مخاطب ہو کر) شمیم کافی

ابھی تک نہیں بنی۔

شمیم: پانی رکھ آئی ہوں۔

ممی: بیٹی پانی تو ابل رہا ہے۔ (شمیم اٹھ کر جلدی سے جاتی ہے ممی بیٹھ جاتی ہیں) میں یہ پوچھوں ہوں کہ کیا جہیز کا سامان جہیز کے لیے نہیں آیا ہے؟

ڈیڈی: اور کس لیے آیا ہے؟

ممی: تو اپنے بیٹوں کو بھی بتا دو کہ یہ جہیز کا سامان ہے۔

ڈیڈی: آخر یہ لوگ بچے تو نہیں ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے۔

ممی: انھیں معلوم ہوتا تو یہ ایسا ہی کرتے۔ سیر بیس اور باجہ یہاں رکھ لیا۔ سنگھار میز ماجد کے کمرے میں سج گئی۔ ریڈیو زاہد نے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

ڈیڈی: یہ تو واقعی زیادتی ہے۔

[شمیم کافی سیٹ اور کافی کا ڈبہ ٹرے میں لے کر داخل ہوتی ہے اور میز پر سجاتی ہے۔ ممی کافی کی پیالیوں کو غور سے دیکھتی ہیں پھر ایک پیالی کو اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتی ہیں ۔]

ممی: (غصہ سے شمیم کو دیکھتے ہوئے) یہ تو نئی پیالئیں ہیں؟

شمیم: (آہستہ سے) جی۔

ممی: (غصہ سے) یہ کیوں نکلی ہیں۔ تجھے پتہ نہیں ہے کہ یہ کس لیے آئی ہیں۔ اپنا سارا جہیز برباد کر دیجیو۔

شمیم: بھائی جان نے نکلوائی ہیں۔

ماجد: میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم انھیں مستقل استعمال کرو۔ چند معقول ملنے والے آئے تھے۔ اب انھیں پرانے سیٹ میں تو کافی نہیں پلائی جا سکتی تھی۔ اور پرانا سیٹ بھی چائے کا ہے۔ کافی کا تو نہیں ہے۔ بہر حال اس کے بعد تم انھیں احتیاط سے رکھ

دیتیں۔

ڈیڈی: بالکل درست بات ہے۔ بیٹی تھوڑی سی عقل سے کام لینا چاہیے۔

[شمیم کوئی جواب نہیں دیتی۔ سر جھکا کر کافی بنانے لگتی ہے۔ کافی بنا کر پالیاں سب کی طرف بڑھاتی ہے۔ ماجد کی پیالی میں دودھ نہیں ہے۔]

ممی: بیٹے دودھ ڈال لیا کرو۔ خالی کافی تو سینے کو جلا دیتی ہے۔

ماجد: میں کافی میں کھوٹ ملانے کا قائل نہیں ہوں۔

ممی: (زاہد کی پیالی دیکھتے ہوئے جس میں دودھ برائے نام ہے) دودھ اور ڈال آیا۔ بڑا کہیں کا۔ تو بھی کوئی امریکہ سے آیا ہے۔

[دودھ دانی اٹھ کر زاہد کے احتجاج کے باوجود بہت سا دودھ اس کی پیالی میں ڈالتی ہیں زاہد بری نظروں سے اس پیالی کو دیکھتا ہے ایک گھونٹ لیتا ہے اور بے مزہ ہو کر رکھ دیتا ہے]

ماجد: میں آج ایک فرج دیکھ کر آیا ہوں۔ زیادہ برا بھی نہیں ہے۔ درمیانہ سائز ہے۔ اچھا ہے۔

ڈیڈی: اور قیمت؟

ماجد: زیادہ مہنگا نہیں ہے۔

ڈیڈی: اپنی ماں سے بات کرو۔

ماجد: ممی کیا خیال ہے آپ کا؟

ممی: اجی فیشن ہی فیشن ہے۔ ویسے تو مجھے اس تام چینی کی الماری میں کوئی خاص بات نظر آتی نہیں۔

ماجد: اس سے بڑا آرام ہو جاتا ہے کوئی کھانے پینے کی چیز اس میں خراب نہیں ہوتی۔

ممی: ہاں خراب تو نہیں ہوتی مگر بیٹا الماری بجلی سے چلتی ہے کھانے کی چیزوں میں بجلی آ جاتی

ہے۔

ڈیڈی: ماجد کی ماں جہالت کی باتیں مت کیا کرو۔ اچھی کہی کہ کھانے میں بجلی بھی آجاتی ہے۔ پھر تو تم ہیٹر بھی استعمال نہیں کرو گی۔

ممی: اے لوج میں کیوں ایٹھر پٹھیر پر ہنڈیاں پکانے لگی۔ مندی آنچ میں جو ہنڈیا پکتی ہے وہ بجلی کے چولھے پر تھوڑا ہی پک سکتی ہے۔

ڈیڈی: (جلتے بھنے لہجے میں) ماجد کی ماں تم تو بالکل بے پڑھے لکھوں کی باتیں کرتی ہو۔

ممی: اچھا مجھے کیا۔ تم ارج خریدو فرج خریدو۔ مگر رقم کہاں سے آئے گی۔ اس کے لیے تو ڈھیری چاہیے۔

ڈیڈی: (سوچتے ہوئے) ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔ مہینے کے خرچ میں سے تو فرج خریدا نہیں جا سکتا۔

ممی: اور ڈاخانے میں سے میں روپیہ نہیں نکالنے دوں گی۔ کان کھول کر سن لو وہ ساری رقم شمیم کے بیاہ کے لیے ہے میں اس سے کوڑی خرچ نہیں کرنے دوں گی۔

ڈیڈی: (ماجد کی طرف رخ کر کے) بھئی پھر تو مشکل ہے۔

ماجد: مگر ممی آپ شادی کے سلسلہ میں اتنی پریشان کیوں ہیں؟

ممی: اے لو یہ ایک ہی کہی۔ بیٹے جب تم گھر والے ہو گے اور جوان بیٹی ہو گی تو تمھیں پتہ چلے گا۔ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ کیوں اتنی پریشان ہوں۔

ماجد: نہیں ممی میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پیسے کی طرف سے آپ کو کیا فکر ہے۔ آخر میری بھی تو سروس ہو گی؟

ممی: اے بیٹے کب ہو گی۔ میں تو دن گنتے گنتے تھک گئی ہوں۔

ماجد: ایک offer تو میں نے ابھی کل ہی reject کی ہے۔

ممی: بیٹے ہوش کی دوا لو۔ آئے ہوئے رزق کو ٹھوکر نہیں مارا کرتے۔ پھر رزق ٹھوکر مارتا ہے

اور رزق کی ٹھوکر بری ہوتی ہے۔

ماجد: میں چھوٹی موٹی نوکری تو کر نہیں سکتا۔

ممی: میرے لال بڑی نوکری نہ ملی تو کیا ہوگا؟

ماجد ملے گی کیسے نہیں۔ میرے پاس امریکہ کا ڈپلوما ہے۔

ممی: انشا اللہ ملے گی۔ میرا لال ڈگریوں والا ہے۔ اللہ چاہیے تو بڑی نوکری ملے گی۔ مگر بیٹا اس ارج فرج کو نوکری کے وقت تک کے لیے اٹھا رکھو۔

ماجد: (لجاجت آمیز لہجہ میں) بوجان ملنے والے آجاتے ہیں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے اور ملنے والے سب ہی status کے لوگ ہیں۔

ڈیڈی: ہاں بھئی یہ تو ٹھیک ہے۔ میں کہتا ہوں گھر میں جو حال بھی ہو مگر باہر والوں کے سامنے آنکھ نیچی نہیں ہونی چاہیے۔

ممی: ارے واہ تم بڑے آئے آنکھ نیچی کرانے والے۔ کیوں ہوتی میرے لال کی آنکھ نیچی ۔وہ کسی سے کم ہے۔ امریکہ سے ڈگری لے آیا ہے۔

ڈیڈی: ہاں بھرم تو بہت بھاری ہے اور میں کہتا ہوں جب پوزیشن بنی ہوئی ہو تو اسے گرنے نہیں دینا چاہیے۔ فرج بذات خود کوئی شئے نہیں لیکن پوزیشن کا سوال ہے۔

[ممی خاموش رہتی ہے ڈیڈی ممی کو دیکھتے ہیں پھر شمیم سے مخاطب ہوتے ہیں]

شمیم: (چونک کر) جی پاپا جان۔

ڈیڈی: ذرا ہماری چیک بک نکالو۔ (شمیم تذبذب کے عالم میں ممی کی طرف دیکھتی ہے) بیٹی سوچ کیا رہی ہو؟ (شمیم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے)

شمیم: (سٹپٹا کر) جی۔ اچھا! (پھر ممی کی طرف دیکھتی ہے) ممی!

[شمیم آہستہ سے نکل جاتی ہے۔۔ وقفہ۔ سب چپ رہتے ہیں۔ شمیم چیک بک لے کر واپس آتی ہے اور خاموشی سے ڈیڈی کی طرف بڑھا دیتی ہے۔ ماجد جیب سے پن

نکال کر ڈیڈی کی طرف بڑھا تا ہے۔ ڈیڈی خاموشی سے چیک لکھ کر ماجد کی طرف
بڑھاتے ہیں۔]

ماجد: (چیک جیب میں رکھتے ہوئے) (کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتا ہے) ابھی تو بنک کا وقت ہے۔ جلدی تیار ہو جاؤں تو چیک اسی وقت کیش ہو سکتا ہے۔

ڈیڈی: (چیک بک شمیم کو دیتے ہوئے) آج جمعہ ہے بنک جلدی بند ہو جائیں گے۔

ماجد: (اُٹھتے ہوئے) دن آج جمعہ ہے۔ (دائیں دروازے سے نکلتا ہے)

ڈیڈی: (کھڑے ہوتے ہوئے) میں بھی ڈاک دیکھ آؤں۔ اے شمیم بیٹی ہماری اچکن ٹوپی تو لاؤ۔ (شمیم دائیں دروازے سے نکل جاتی ہے)

ممی: (فکر کے لہجے میں) عابد کا منی آرڈر ابھی تک نہیں آیا۔ نہ کوئی خط آیا۔

ڈیڈی: دوسرے ملک کی بات ہے۔ ڈاک آتے آتے ہی آتی ہے۔

ممی: مگر خط گئے ہوئے کافی دن ہو گئے۔ اب تک تو جواب آ جانا چاہیے تھا۔

[شمیم اچکن ٹوپی لے کر آتی ہے۔ ڈیڈی پہنتے ہیں۔ اور بائیں دروازے سے نکل جاتا ہے۔ شمیم واپس دائیں دروازے سے نکل جاتی ہے بشیرن داخل ہوتی ہے۔)

بشیرن: (برقعہ اتارتے ہوئے) نیم والی آپا۔ اچھی ہو؟

ممی: اللہ کا شکر ہے۔ (آواز دیتی ہے) شمیم ذرا پان دان دے جا (کہتے ہوئے) بیٹھو بی بی۔ (اندر سے آواز آتی ہے) (''لائی ممی'')۔

بشیرن: (ممی کے برابر صوفے پر بیٹھے ہوئے) نیم والی آپا۔ تم دوسروں کے بھرے میں مت آجایا کرو۔

ممی: اے ہے۔ میں کس کے بھرے میں آ گئی۔

بشیرن: لو کسی کے بھرے ہی میں نہیں آئیں۔ کچے گھر والی آفت کی پرکالہ ہے۔ اس کی باتوں میں مت آجایا کرو۔

ممی: میں اس کی باتوں میں کیوں آجاتی۔مگر تحصیلدارنی نے بات ہی ایسی کہی تھی۔

بشیرن: نیم والی آپا۔ بیٹی والی کو ضبط سے کام لینا چاہیے اور کچے گھر والی کیا ہے وہ تو جیسے بات کی بات بتاتی ہے۔

ممی: آخر تحصیلدارنی نے کچھ تو کہا ہوگا۔ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ بات کچھ بھی نہیں ہو اور کوئی اتنی بڑی بات کسی کے سر لگادے۔

بشیرن: یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تم کچے گھر والی کو نہیں جانتیں ۔ میں اس حرامی کو خوب جانتی ہوں (typul)۔اسے شک پڑ گیا کہ یہاں کوئی بات چل رہی ہے۔تو اس نے اپنی طرف سے یہ شگوفہ چھوڑ دیا۔ تم سوچا تو کرو کہ کس نے یہ بات کیوں کہی ہے۔ بیٹی والی کو تو آنکھ کان کھول کے رہنا چاہیے۔

ممی: خیر۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر تحصیلدارنی بوا کو اپنے بیٹے پہ غرور ہو گیا ہے۔

بشیرن: جس کا اچھا بیٹا ہوگا وہ غرور بھی کرے گی۔

ممی: ہوگا اچھا ہمیں کیا؟

بشیرن: کیوں تم بیٹی کی ماں نہیں ہو؟

ممی: مگر میں اپنی بیٹی کو تھالی میں رکھ کے لیے لیے نہیں پھرتی۔

بشیرن: تم سے کون کہہ رہا ہے کہ تھالی میں رکھ کے لیے لیے پھرو۔مگر جس گھر میں لڑکا ہوگا اس گھر میں تو ہر لڑکی کا ذکر آئے گا۔اور شمیم کا ذکر کیسے نہ آئے گا لاکھوں میں ایک لڑکی ہے۔میں تحصیلدارنی بوا کو سمجھایا تو ان کی سمجھ میں بات آئی۔

ممی: اچھا بی بی تو کہتی ہے تو سچ ہی کہتی ہوگی۔

بشیرن: نیم والی آپا۔شمیم میری بیٹی ہے میں یہ منگنی کرا کے رہوں گی۔

ممی: مگر لڑکے کی عادت خصلت کیسی ہے؟

بشیرن: بس یہ سمجھ لو کہ لڑکا ہیرا ہے۔

ممی: اچھا؟

بشیرن: ہاں۔ اور نیم والی آپا۔ میں تو جانوں ہوں کہ لڑکوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے۔ روز ایک پکڑ لو۔ مگر بات تو جب ہے کہ اچھا لڑکا ملے اور اچھا لڑکا تو قسمت سے ہی ملتا ہے۔ یہی میں نے تحصیلدارنی بوأ سے بھی کہا کہ بوأ لڑکیوں کی کمی نہیں ہے روز ایک نکاح پڑھالو۔ مگر اچھی لڑکی بھاگوانوں کو ملتی ہے۔

ممی: میں کہتی ہوں ایسی لڑکی انھیں ملے گی نہیں!

بشیرن: اجی وہ ایسی انجان تھوڑا ہی ہیں۔ انھوں نے خوب ٹوہ لے لی ہے اس کے بعد انھوں نے حامی بھری ہے۔

ممی: ہاں ہاں۔ ضرور ٹوہ لیں۔ خوب چھان بین کرلیں۔

بشیرن: چھان بین انھوں نے کر لی ہے مگر بڑی عقل مند ہیں۔ چندرا چندرا کے باتیں کرتی ہیں۔ کہنے لگیں کہ بھئی ہم تو یہ چاہیں ہیں کہ ہماری ساری حسرتیں پوری ہوں۔

ممی: بی بی ان سے یہ کہو ہماری بیٹی گری پڑی نہیں ہے۔ اللہ رکھی باپ بھیوں والی ہے۔ اور بھیے ایسے ویسے نہیں ہیں امریکہ والے ہیں۔ بہن کو سونے میں نہلا دیں گے۔

بشیرن: خدا اس کے باپ بھیوں کو سلامت رکھے۔ ایسا جہیز ہوگا کہ تحصیلدارنی بوأ کی آنکھوں میں چکا چوند آجائے گی۔

ممی: اللہ نے چاہا تو بہت دھوم کی شادی کروں گی۔

بشیرن: اے نیم والی آپا۔ تمہارا بڑا بیٹا بھی آئے گا یا نہیں۔

ممی: اجی تمہارا عابد آنے کو تو آج آجائے مگر امریکہ والا اس کی لیاقت پہ ایسا واری ہوا ہے کہ اسے آنے نہیں دیتا۔

بشیرن: عابد کی عمر بھی اچھی خاصی ہوگئی ہے۔ اللہ ساتھ خیر و عافیت کے اسے امریکہ سے لائے۔ اب تم اس کا بیاہ کرو۔

ممی: بہن میں تو خود چاہوں کہ گھر میں بہو آ جائے۔ اب شمیم بھی چلی جائے گی تو میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔ (تھکی ہوئی آواز میں) اور بی بی اب میرے ہاتھ پاؤں میں دم نہیں ہے۔ میں گھر نہیں سنبھال سکتی۔

بشیرن: خدا تمہارا بھلا کرے یہی تو میں کہہ رہی ہوں اب تو تمہارے آرام کرنے کے دن ہیں۔ بہو آ جائے تو تم پلنگ پر بیٹھو۔ وہ گھر بار سنبھالے گی۔ اور تمھاری خدمت کرے گی۔

ممی: (پان دان کھولتے ہوئے) ہاں میں تو یہی چاہوں ہوں کہ گھر کوئی اور سنبھالے میں بیٹھ کے اللہ اللہ کروں (پان لگانے لگتی ہیں)

بشیرن: بو جان۔ بہو بھی میں تمھیں ایسی لا کر دوں گی کہ سارا گھر سنبھالے گی۔ اور دونوں وقت تمہارے سامنے سینی میں لگا کر کھانا دیا کرے گی بس تم نیت باندھ لو۔

ممی: اے بی بی۔ میری نیت کا کیا ہے وہ تو بندھی بندھائی ہے مگر عابد نہیں مانتا۔ میں نے تو اسے شمیم کی شادی کے لیے جو خط لکھا تھا اس میں بھی یہی لکھوایا تھا کہ بیٹا میں یہ چاہوں ہوں کہ بیٹی کو گھر سے رخصت کروں اور بہو کو گھر میں لاؤں (پان بشیرن کی طرف بڑھاتی ہیں)

بشیرن: (پان لیتے ہوئے) اجی ابھی تو پان کھایا ہی تھا۔

ممی: اے لو ابھی کھایا تھا۔ اتنی دیر ہوگی۔

بشیرن: (پان چباتے ہوئے) پھر اس نے کیا جواب لکھا؟

ممی: بی بی اس نے تو یہ جواب دیا ہے کہ جب تک شمیم کا بیاہ نہیں ہو جاتا میں اپنی شادی کا نام نہیں لینے دوں گا۔

بشیرن: اے ہے شمیم کا بیاہ تو ہو ہی رہا ہے اس میں اب کونسی دیر ہے۔

ممی: بی بی تمہارا عابد بہن کا بیاہ بڑی دھوم سے کرے گا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔

بشیرن: اب تم اسے خط ڈال دو کہ پیسے کا انتظام کرلو۔

ممی: بی بی پیسے کے انتظام کی بات تو یہ ہے کہ پیسے کا انتظام تو ہے ہی تمہارے عابد کو امریکہ والے وظیفہ دے کے بلایا ہے۔ اور ماشا اللہ اوپر سے وہ بہت کما رہا ہے تو پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اور میں اسے خط لکھ چکی ہوں۔ بس اب تو منی آرڈر کا انتظار ہے۔

بشیرن: پھر کیا دیر ہے میں تو یہ کہوں ہوں کہ جلدی سے میں فریضہ سے سبکدوش ہو جاؤں۔ بس خالی کے مہینے میں نپٹ جاؤ۔

ممی: نا بی بی دو عیدوں کے بیچ میں تو اپنی بیٹی کو رخصت نہیں کروں گی۔

بشیرن: تو پھر بقرعید کے بعد رکھ لو۔ دیر کرو گی تو پھر محرم کا چاند آ جائے گا۔

ممی: ہاں بقرعید کے بعد کروں گی۔ بیٹے والے تاریخ دیکھ لیں۔ قمر در عقرب نہ ہو۔ (موٹر ہارن کی آواز۔ موٹر رُکنے کی آواز)۔ (چونک کر) ماجد آ گیا۔

بشیرن: (برقعہ سنبھالتے ہوئے) تو بی بی میں چلی۔

ممی: اے ہے ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

بشیرن: (کھڑے ہوتے ہوئے) نا بی بی بہت دیر ہو گئی۔ میں اب چلوں گی۔
(برقعہ اوڑھتے ہوئے چلنے لگتی ہے)

ممی: اری پھر کب آئے گی؟

بشیرن: بس خاطر جمع رکھو۔ آج ہی ساری بات کروں گی۔ پھر کل آؤں گی۔

[نکل جاتی ہے۔ باہر موٹر کا دروازہ زور سے بند ہوتا ہے۔ چند لمحوں بعد ماجد بڑے کینوس پر بنی ہوئی ایک تصویر لیے داخل ہوتا ہے۔ ذرا ممی کے سامنے لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔]

ماجد: (تصویر کو سامنے کرتے ہوئے) بو جان دیکھیے۔

ممی: (آنکھیں مچکا مچکا کر تصویر کو دیکھتی ہیں۔ افسوس کے لہجے میں)
اے ہے یہ کس ڈربے نے نئی کرچ پہ روشنائی لیس دی ہے۔

ماجد:	(دانت کچکچا کر جھنجھلاتے ہوئے) اوہ مائی گاڈ۔ بوجان یہ ایبسٹر کٹ پینٹنگ ہے۔
(آواز دیتے ہوئے) شمیم!

شمیم:	(دوسرے کمرے سے) جی بھائی جان۔

ماجد:	come on

شمیم:	(دوسرے کمرے سے آواز) آئی۔

[قدموں کی چاپ۔ شمیم داخل ہوتی ہے۔ ماجد دونوں ہاتھوں میں تصویر تھام کر کھڑا ہو جاتا ہے]

ماجد:	شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے) کیسی ہے تصویر؟

شمیم:	(تصویر کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے) تصویر؟

ماجد:	(دانت کچکچا کر)you too brutus

شمیم:	(سٹپٹا کر) ہائے اللہ، کیا ہے یہ؟

ماجد:	نئی عورت۔

شمیم:	(حیران ہو کر) نئی عورت؟ کہاں ہے اس میں؟

ماجد:	exactly یہی تو اس تصویر میں idea ہے کہ عورت کہاں ہے؟ نئی عورت نئی ہے۔
مگر عورت نہیں ہے۔

شمیم:	(رونسی ہو کر) ہائے اللہ بھائی جان! آپ ہم سے کیا پہیلی بجھوا رہے ہیں۔

ماجد:	(غصہ سے) سخت ان کلچرڈ لڑکی ہے (بات بدلتے ہوئے) خیر قصہ مختصر یہ پینٹنگ ڈرائنگ روم کے لیے ہے۔ میں نے سوچا کہ ڈرائنگ روم میں ایک معقول قسم کی پینٹنگ بھی ہونی چاہیے۔ (چاروں طرف دیواروں کو دیکھتے ہوئے) کہاں مناسب رہے گی (پھر بڑھ کر مختلف دیواروں پر کبھی تھوڑا اوپر کبھی تھوڑا نیچے لگا کر دیکھتا ہے۔ پھر ریڈیو گرام کی سمت والی دیوار میں لگا کر کہتا ہے۔) فائن۔ یہاں مناسب رہے گی

۔(شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے) کیوں شمیم؟

شمیم: ہاں بالکل ٹھیک ہے۔

ممی: اس نئی نوکری کا کیا بنا؟

ماجد: (لاپروائی سے) بوجان میں نے offer ریجیکٹ کر دی۔

ممی: (گھبرا کر) اے نا؟

ماجد: ہاں امی سچ کہہ رہا ہوں۔

ممی: (دکھ سے) میرے لال آتے رزق کو کب تک ٹھوکر مارو گے۔

ماجد: بوجان میرے پاس foreign کوالیفیکیشن ہے۔ معمولی تنخواہ پہ کیسے چلا جاؤں؟ پورے کیریر کا سوال ہے۔

[دروازہ کھلتا ہے باہر سے ڈیڈی داخل ہوتے ہیں صورت سے کچھ تھکے تھکے کچھ اداس اداس۔ آ کر مونڈھے پر بیٹھ جاتے ہیں۔)

ممی: اجی کوئی خط آیا؟

ڈیڈی: (شمیم سے) بیٹی حقہ لاؤ۔ (شمیم چلی جاتی ہے)

ممی: (بڑبڑاتے ہوئے) ادھر عابد کی طرف سے بھی جواب نہیں آیا اور بیاہ سر پر آ گیا ہے۔ نہ منی آرڈر آیا نہ خط۔

ڈیڈی: خط تو آ گیا ہے مگر منی آرڈر نہیں آئے گا۔

ممی: آئے بڑے کہیں کے بری آوازیں نکالنے والے۔ میرے بیٹے کا تو ایسا کھنکھناتا منی آرڈر آئے گا کہ یاد کرو گے۔

ڈیڈی: (سانس ٹھنڈا بھرتے ہوئے) اچھا یونہی سہی۔ (جیب سے خط نکال کر خاموشی سے ماجد کی طرف بڑھا دیتے ہیں)۔

ممی: (اشتیاق سے) عابد کا خط آیا ہے۔ کیا لکھا ہے؟

ڈیڈی: (بدمزہ لہجہ میں) پوچھ لو اپنے بیٹے سے۔

[ماجد خاموشی سے خط پڑھتا رہتا ہے پھر خط تہ کر کے پاپا کے حوالے کر دیتا ہے۔]

ماجد: (خوشی سے) گڈ۔ مجھے congratulation کا تار دینا چاہیے۔

ممی: (بے تابی سے) کیا ہوا؟ (شمیم حقہ لے کر داخل ہوتی ہے حقہ ڈیڈی کے سامنے رکھتی ہے۔)

ماجد: ڈیڈی اب تو واقعی عذر جائز ہے۔ شادی کے بعد اخراجات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

ممی: (سٹپٹا کر) شادی کے بعد؟۔۔۔ اے کیسی شادی؟

ڈیڈی: (تلخ طنزیہ لہجہ میں) تمہارے بیٹے کی شادی۔ اور کس کی شادی۔ اس نے وہاں میم سے شادی کر لی ہے۔

ممی: (بدحواس ہو کر) میم سے شادی۔۔۔۔ نہیں میرا بیٹا ایسا نہیں کرے گا۔

ڈیڈی: مگر اب تو اس نے ایسا کر لیا ہے۔ کہتا ہے کہ اخراجات بہت ہو گئے ہیں فی الحال رقم نہیں بھیجی جا سکتی۔ (درشت لہجہ میں) بے ایمان۔

[حقہ پینے لگتے ہیں۔ شمیم کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔ ممی تکتی رہتی ہیں۔ پھر آنچل منہ پر رکھ کر سسکیاں لینا شروع کر دیتی ہے۔]

پردہ گرتا ہے

تیسرا ایکٹ

[تحصیلدارنی کا گھر۔ ایک کمرہ جس میں ایک مسہری بچھی ہے۔ فرنیچر قیمتی مگر پرانا کمرے کی آرائش بھی پرانی طرز پر ہے۔]

تحصیلدارنی: (پان بناتے ہوئے) بی بی کہاں نکلوں اور کب نکلوں۔ میں ٹھہری پردیسن۔ یاں کی بیبیوں سے ڈروں ہوں۔ ایک ایک کی چار چار کر کے کہتی ہیں۔ میں پردیس میں رہی۔ میں ان کی باتوں کو کیا سمجھوں؟

بشیرن: اجی یہ تم نے نئی بات پکڑی ہے ۔تم پردیسن کہاں سے ہو گئیں ۔ پشتیں تو یہاں گذریں۔ چار دن کے لیے تم پردیس چلی گئیں تو پردیسن بن گئیں ۔سچ پوچھوتو یاں کے پرانے رہنے والے تو خان بہادر صاحب ہی ہیں ۔ جما جمایا خاندان تو یہی تھا۔توتم پردیسن کیسے ہوگئیں ۔

تحصیلدارنی: بی بی اب تو ہیں ۔اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ گھر سے کب نکلوں تمہارے تحصیلدار صاحب ایسے ہیں کہ دم بھر کے لیے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے ۔

بشیرن: بڑھاپا بھی عجیب چیز ہے ۔بیوی ماں بن جاتی ہے میاں گود کا بچہ بن جاتا ہے ۔

تحصیلدارنی: (پان دیتے ہوئے) یہ سچ کہو ہو بالکل بچوں کی سی ہڑک کرتے ہیں ۔اور پھر یہ بھی ہے کہ بڑھاپے میں دیکھ بھال کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کوئی پوتی ہوتی ،نواسی ہوتی تو وہ خدمت کرتی اب انھیں کس پر چھوڑ کے نکلوں ۔

بشیرن: خیر پوتی کا تو یہ ہے کہ پہلے دھیان دیا ہوتا اور بہو لے آئی ہوتیں تو آج بیاہ قابل پوتی ہوتی ۔

تحصیلدارنی: خیر بی بی میرا دھیان تو اب بھی اس طرف نہیں ہے ۔

بشیرن: نا تحصیلدارنی بوا اب تو اس طرف دھیان ہونا چاہیے ۔اکیلے دم کے ساتھ آخر کب تک گھر چلاؤ گی ۔

تحصیلدارنی: ہاں بس کبھی کبھی یہی سوچتی ہوں کہ بہو آ جائے گی تو گھر میں ایک سے دو دم تو دکھائی دیں گے ۔

بشیرن: اور کیا۔اور پھر اب تمہارے آرام کا وقت ہے بہت کام کر لیا بہت گھر بار سنبھالا ۔

تحصیلدارنی: بی بی اب میں بہت تھک گئی ہوں یہ سوچو کہ میں تو سدا سے اکیلی ہی رہی ۔نہ کوئی بیٹی نہ کوئی بہو ۔اور تمہارے تحصیلدار صاحب کی تحصیلداری کے زمانے میں یہی رہا کہ ایک مہمان جا رہا ہے دوسرا آ رہا ہے ۔آج فلاں افسر کی دعوت کل فلاں ملنے والے کا

کھانا۔سارے انتظام میرے اکیلے دم کے ساتھ تھے۔

بشیرن: ہاں آدمی آخر آدمی ہے۔کب تک نہ تھکے گا۔تبھی تو میں کہوں کہ بس چٹ پٹ بہو لی آؤ۔

تحصیلدارنی: بہوتو میں کل کے ہوتے میں آج لی آؤں مگر کوئی ایسی ملے کہ آ کر گھر سنبھال لے۔ساس سسر کا برھاپا خراب نہ کرے۔

بشیرن: انشاﷲ ایسی ہی ملے گی۔

تحصیلدارنی: بی بی اب میری آنکھیں جواب دے گئیں۔کل ہی کی بات ہے تحصیلدار صاحب کے ایک ملنے والے کا کھانا تھا۔میں بریانی پکانے بیٹھ گئی۔کچھ اٹکل ہی نہ پڑی۔زیادہ پانی پڑ گیا۔سارا چاول بیٹھ گیا۔

بشیرن: بھئی انصاف کی بات ہے بریانی تو ہماری نیم والی آپا کی لونڈیا پکاتی ہے کیا کوئی باورچی پکائے گا۔تحصیلدارنی بوا۔اس کے ہاتھ میں چاول ایسا کھلتا ہے کہ دیگچی اتار کے بکھر دو اور ایک ایک دانہ گن لو۔

تحصیلدارنی: ہاں پکانے کی ترکیب تو ہوتی ہی ہے مگر ہاتھ کی بھی بہت بات ہوتی ہے۔بعضوں کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ ہوتا ہے۔

بشیرن: ذائقہ کی تو یہ بات ہے کہ وہ ڈوبی جو بھی چیز پکاتی ہے ایسی ذائقے دار ہوتی ہے بس ہونٹ چاٹا کرو۔اور وہ کون سا کھانا پکانا نہیں جانتی۔ہر کھانا پکا لیتی ہے اور خوب پکاتی ہے۔

تحصیلدارنی: چلو یہ اچھی بات ہے۔ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو چولہے پہ بیٹھتی ہی نہیں۔

بشیرن: اجی وہ ان میں سے نہیں ہے۔وہ تو ماشاﷲ سارے کام کرتی ہے۔کھانا وہ پکاتی ہے۔سینا پرونا وہ کرتی ہے۔تراش تو اس کی ایسی اچھی ہے کہ بڑے بڑے درزی اس کے سامنے مات ہیں۔

تحصیلدارنی : یہ اور بھی تعجب کی بات ہے ہم نے تو یہی دیکھا کہ آج کل کی لڑکیاں ہاتھ میں قینچی پکڑنا نہیں جانتیں۔ چھوٹے بڑے سب (کے لیے) کپڑے درزی سے سلواتی ہیں۔

بشیرن: وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ چرپائی پر بیٹھنا تو وہ جانتی ہی نہیں گھر کے اندر چک پھرکی بنی رہتی ہے۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ بہت کام کرتی ہے اور بہت سلیقہ والی ہے۔

تحصیلدارنی : مجھے تو وہ لونڈیا خود پسند ہے مگر نیم والی تو اپنی بیٹی کا نام ہی نہیں لینے دیتی۔ اب تو اس کے لیے کوئی عرش کا تارا ہی آئے گا۔

بشیرن: اجی تحصیلدارنی بوأ کیسی باتیں کرتی ہو۔ تمہارے بیٹے کے لیے کون تیار نہ ہوگا۔ ایسا لڑکا رتو ڈھونڈے سے نہ ملے گا۔

تحصیلدارنی: تو نے ٹوہ لی تھی؟

بشیرن: میں نے سب ٹوہ لے لی ہے۔ نیم والی آپا کو تھوڑی سی یہ فکر تھی کہ جانے کیسی عادت خصلت ہو۔ اور بھئی ان کی فکر سچی ہے آخر تم پردیس ہی میں رہیں۔ وہیں وہ پلا بڑھا۔ کسی کو کیا خبر اس کی عادت خصلت کی۔ میں نے نیم والی آپا سے کہا کہ لڑکا تو ہزاروں میں ایک ہے۔ دنیا ڈھونڈو گی تو ایسا نہیں ملے گا۔ بوأ یہی میں نے ان سے کہا اور یہی تم سے کہوں ہوں کہ دنیا میں نہ لڑکوں کی کمی ہے نہ لڑکیوں کی۔ جی چاہے تو روز ایک نکاح پڑھواؤ۔ مگر اچھا لڑکا اور اچھی لڑکی کا مل جانا بس قسمت کی بات ہے اور خاص طور پر اس زمانے میں۔

تحصیلدارنی: اری اس زمانے پہ تو خدا کی سوار ہے۔ لڑکے سرکش ہو گئے لڑکیوں کا دیدہ پھٹ گیا۔

بشیرن: میں تو اسے نصیبوں ہی کی بات کہوں گی کہ خدا نظر بد سے بچائے لڑکی ہیرا ہے اور لڑکا لال۔ (وقفہ۔ چاروں طرف دیکھ کر) اے تحصیلدارنی بوأ جہیز کہاں رکھو گی؟

تحصیلدارنی: (چکرا کر) جہیز کہاں رکھوں گی؟ کہاں رکھتی، ہیں رکھوں گی۔

بشیرن: خیر ماشااللہ تمہارا گھر بھی حویلی ہے مگر اللہ رکھی پشتیں گھر ہے اس میں اپنا سامان بہتیرا ہے۔ جہیز آئے گا تو کہاں رکھا جائے گا۔

تحصیلدارنی: بی بی وہ بھی یہیں رکھا جائے گا۔

بشیرن: تحصیلدارنی بوا شمیم جہیز ایسا ویسا لے کے نہیں آئے گی۔ اس کا جہیز رکھنے کے لیے ایک گھر اور بنواؤ۔ بھیا امریکہ سے روز ایک لٹی بھیجے ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ سارا جہیز امریکہ کا ہوگا۔ تو اسے سنگھوانے کی کرو اور گھر بنواؤ۔

تحصیلدارنی: اور گھر بھی بن جائے گا بہو تو آئے۔

بشیرن: بہو کے آنے میں اب کیا دیر ہے اب تو تم دل پہ دھر لو بہو کل آ جائے گی۔

تحصیلدارنی: ہاں بی بی۔ اب تو میں یہی چاہوں ہوں کہ بہو جلدی سے آئے اور گھر بار سنبھالے۔ میں تو اب آرام کروں گی۔

بشیرن: لو میں آج ہی نیم والی آپا کے پاس جاتی ہوں۔ نیک کام میں دیر کیسی؟ آج ہی فیصلہ کرتی ہوں۔

تحصیلدارنی: ہاں بی بی۔ اب فیصلہ کر ہی ڈالو۔

بشیرن: (کھڑے ہوتے ہوئے) بس میں چلی آج ہی شام کو اُدھر جاؤں گی۔ (نکل جاتی ہے ـــــ وقفہ ـــــ کچے گھر والی داخل ہوتی ہے)

کچے گھر والی: تحصیلدارنی بوا۔ اچھے ہو؟

تحصیلدارنی: اللہ کا شکر ہے (سرکتے ہوئے) آ بیٹھ اری کیسے جا تو۔

کچے گھر والی: (بیٹھتے ہوئے) اجی کیا بتاؤں کیسے ہوں گھر میں سب چرپائی پر پڑے ہیں۔ کسی کو بخار کسی کو نزلہ، کسی کے سر میں درد۔

تحصیلدارنی: جبھی تو میں کہوں ہوں کہ کچے گھر والی کئی دن سے دکھائی نہیں دی۔

کچے گھر والی: اجی ایک تو گھر میں سب بیمار۔ پھر تحصیلدارنی بوا بات یہ ہے کہ میں ہوں زبان

پھوہڑ۔ بات زبان پہ آجائے تو رکتی نہیں۔ جبھی تو میں برادری میں سب کی بری ہوں۔
میں سوچوں ہوں کہ نہ باہر نکلوں گی نہ باتیں سنوں گی نہ زبان سے کوئی بات نکلے گی۔ تو
میں اب گھر سے نکلتی ہی نہیں۔

تحصیلدرانی: (پاندان کھولتے ہوئے) مگر گھر میں بند ہو کے بھی نہیں بیٹھا جا سکتا۔ اور میں تو گھر
میں اکیلی ہوں۔ کوئی بات کرنے والا ہی نہیں۔ اب گھر میں بیٹھوں تو خفقان ہونے لگتا
ہے باہر نکلوں تو تہمتیں لگتی ہیں۔

کچے گھر والی: اجی تمھاری بات اور ہے مگر میں تو ایک بات کہوں تو سب بیبیاں پیچھے پڑ جاتی ہیں۔
اور میری ایسی بری عادت ہے کہ چھوٹی بات ہو تو میں ضرور ٹوکتی ہوں۔ بھلا میں نے
کسی پہ کوئی تہمت تو نہیں لگائی تھی۔ ایک چلتی سی بات کہی تھی۔ نیم والی آپا اور بشیرن
خالہ دونوں پنجے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑ گئیں۔

تحصیلدارنی: اے ہے اس میں پیچھے پڑنے کی کون سی بات تھی جو بات ہوتی ہے وہ تو کہی جاتی
ہے۔

کچے گھر والی: تحصیلدارنی بوا سچی بات تو کڑوے نیم سے زیادہ کڑوی ہوتی ہے اسے کون سننا
چاہتا ہے۔ اور نیم والی آپا تو بات بات پہ زبان پکڑتی ہے۔ میں نے تو کہہ دیا کہ نیم
والی آپا پکتے آم کی خوشبو اور کنواری لڑکی کی بات تو نکلتی ہی ہے۔ ہاں لڑکی اگر تھک
جائے تو پھر کون اس کا ذکر نہیں کرتا۔

تحصیلدارنی: بھئی کوئی کیڑے ڈالے تو خیر برا ماننا ٹھیک ہے مگر اس لونڈیا کی تو سب ہی تعریف
کرتے ہیں۔

کچے گھر والی: اچھی لڑکی ہوتی تو کیوں لوگ تعریف نہ کریں گے اور وہ لونڈیا تو بہت ہی اچھی ہے۔
کل مجھے شفا خانے میں مل گئی تھی، ایسی تمیز سے اس نے سلام کیا کہ میرے روئیں
روئیں سے اس کے لیے دعا نکلی۔

تحصیلدارنی: اچھی تو ہے؟ شفا خانے کیوں گئی تھی؟

کچے گھر والی: نہیں ویسے تو وہ اچھی ہی ہے۔ شفا خانے جانے کا کچھ اسے شوق ہی ہے۔ میں تو جب جاؤں ہوں اسے وہاں دیکھوں ہوں۔

تحصیلدارنی: شفا خانے شوق میں کوئی نہیں جاتا۔

کچے گھر والی: آجکل کی لڑکیاں شوق میں بھی شفا خانے جاتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ صحتیں اب پہلی سی نہ رہیں۔

تحصیلدارنی: ہاں پہلے کون ہسپتال جاتا تھا۔ چھوٹی موٹی تکلیف ہوتی تو بڑی بوڑھیاں ہی چپئ پئ دیے کے ٹھیک کر دیا کرتی تھیں۔

کچے گھر والی: تحصیلدارنی بوا۔ تمھیں یقین نہ آوے گا۔ میری یہ عمر آ گئی میں نے آج تک کوئی دوا نہیں کھائی۔ نئی لڑکیوں پہ تو ایسی خدکی سنوار ہے کہ ذرا سیانی ہوئیں اور شیشی لے کے شفا خانے میں پہنچ گئیں۔ اپنی نیم والی آپا ہی کی لونڈیا کو دیکھ لو۔۔۔۔ روز شیشی لیے شفا خانے میں کھڑی ہوتی ہے۔

تحصیلدارنی: ویسے تو اچھی لڑکی ہے۔

کچے گھر والی: تحصیلدارنی بوا۔ لاکھوں میں ایک۔ بس ماں ذرا کھری ہے۔ مگر بیٹی تو بہت ہی میٹھی طبیعت کی ہے۔

تحصیلدارنی: (دھیمے لہجے میں) ہاں ماں ذرا کھری ہے۔

کچے گھر والی: اور کھری بھی کیا ہے بس یہ ہے کہ بیٹے امریکہ ہو آئے ہیں تو ذرا طبیعت میں تمکنت آ گئی ہے۔ تو بھئی یہ تو قدرتی بات ہے نیم والی آپا عمر بھر ملی ولی رہیں۔ اب بیٹے بڑے ہو گئے تو تمکنت آنی ہی چاہیے۔ بیٹوں کی کمک بڑی کمک ہوتی ہے۔

تحصیلدارنی: اور ماشااللہ کماؤ پوت ہیں۔

کچے گھر والی: خیر ایک تو ابھی پڑھ لکھ کے گھر ہی بیٹھا تھا ہاں بڑا کماؤ ہے۔

تحصیلدارنی: سنیں ہیں کہ بڑا بیٹا بہت کما رہا ہے۔

کچے گھر والی: ہاں بی بی وہ تو امریکہ کے پیسے میں نہا رہا ہے۔

تحصیلدارنی: بہن کا جہیز تو وہی تیار کر رہا ہے؟

کچے گھر والی: پہلے تو تیار کر رہا تھا اب کا پتہ نہیں۔

تحصیلدارنی: اب کون سی نئی بات ہوگئی؟ جو نہ کرے گا۔ بشیرن کہہ رہی تھی کہ امریکہ سے روز ایک بلٹی آ رہی ہے۔ جہیز سے گھر بھر گیا ہے۔

کچے گھر والی: جہیز تو واقعی نیم والی آپا بہت دتیں مگر۔۔۔ (کہتے کہتے رکتی ہے) خیر مجھے کیا۔

تحصیلدارنی: آخر؟

کچے گھر والی: اجی میں بول کے بری بن جاتی ہوں میں کچھ نہیں کہتی۔

تحصیلدارنی: اے ہے میں کوئی کسی سے کہنے جا رہی ہوں۔

کچے گھر والی: نا بوا۔ میں ایک دفعہ بات کہہ کے چوٹی بن چکی ہوں۔ مجھ کال کھاتی کو کیا پتہ تھا کہ شمیم کی بات چل رہی ہے اور بشیرن خالہ بیچ میں پڑی ہوئی ہیں۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں کبھی بات زبان سے نہ نکالتی۔ میں کسی کا برا نہیں چاہتی۔ نیم والی آپا بکھری جا رہی تھیں میں نے اُن سے صاف کہہ دیا کہ نیم والی آپا! تمھاری بیٹی بڑے گھر میں جا رہی ہے۔ اس کے بھاگ کھل جائیں گے۔ ایسی باتیں مت کرو کہ بات ختم ہو جائے۔ اور میں نے کیا برا کیا۔ نیم والی آپا کی حیثیت ایسی بڑی تو نہیں ہے۔

تحصیلدارنی: نہیں خیر اب تو اچھی خاصی حیثیت ہے۔

کچے گھر والی: ہاں بس اچھی خاصی حیثیت ہے۔ باقی نیم والی آپا کے میاں جو تھے وہ تمھیں پتہ ہی ہے۔ شروع میں چپراسی تھے۔ ترقی کر کے پیشکار بن گئے پیشکاری میں اچھا کمایا۔ مگر پیشکار پھر پیشکار ہے۔ وہ تحصیلدار تو نہیں ہوتا۔ تو نیم والی آپا اور تحصیلدارنی کا کیا مقابلہ؟ ہاں جو تعریف کی بات ہے اس کی تعریف کرنی چاہیے۔ بیٹوں کو انھوں نے اعلیٰ

تعلیم دلائی۔

تحصیلدارنی: اورامریکہ بھجوایا۔

کچے گھر والی: (تحقیر سے دونوں ہاتھ چلاتی ہے) اے امریکہ جانے کا کیا ہے واں تو اونٹ ہانکنے والے بھی پہنچ جاتے ہیں۔

تحصیلدارنی: خیر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

کچے گھر والی: تحصیلدارنی بوا۔ بات کیسے نہ ہوئی۔ ولایت کبھی ایسے ایسے آدمی کو جاتے دیکھا تھا۔ ہماری برادری میں سے تو بس خان بہادر صاحب گئے تھے۔ پوری دنیا میں شور پڑ گیا تھا کہ بھئی ولایت گئے ہیں۔ اس کے بعد تو انھیں خان بہادری ملی تھی۔

تحصیلدارنی: بی بی اب ولایت بھی ولایت نہ رہی۔ اب تو ہرا یرا غیرا واں جانے لگا ہے۔

کچے گھر والی: اب اور جب کا تو مجھے پتہ نہیں۔ میں تو یہ جانوں ہوں کہ ولایت سے جو پاس کر کے آتا ہے وہ بالسٹر بنتا تھا کلکٹر بنتا تھا کمشنر بنتا تھا۔ نیم والی آپا کا پوت امریکہ سے واپس آیا بیٹھا ہے غریب کو نوکری نہیں ملتی۔

تحصیلدارنی: بڑی نوکری کی تلاش میں ہے۔

کچے گھر والی: بڑی نوکری اب تک نہ ملی تو آگے چل کے کیا ملے گی۔ باپ کا جمع کیا ہوا اثاثہ کچھ غارت کر دے گا۔ ایسا فضول خرچ ہے کہ پیسے کی جگہ روپیہ خرچ کرتا ہے۔ ماں باپ نے بیٹی کے بیاہ کے لیے جو جمع کیا تھا وہ بھی پانی کی طرح بہائے دے رہا ہے۔ اوّل تو جمع ہی کتنا کیا تھا۔

تحصیلدارنی: کیوں؟ جمع کیوں نہیں کیا تھا۔ بشیرن تو کہہ رہی تھی کہ بینک میں ان کی بہت رقم ہے۔

کچے گھر والی: پھر بشیرن خالہ ہی ٹھیک کہتی ہیں۔ (چپ ہو جاتی ہے)

تحصیلدارنی: خیر بہن کا بیاہ تو بڑا بھیا کرے گا۔

کچے گھر والی: (منہ بگاڑ کر) اجی کیا کرے گا نگوڑا۔ اس نے تو میم گھر میں ڈال لی ہے۔

تحصیلدارنی: (چونک کر) کیا؟

کچے گھر والی: بھئی سنا ہے کہ عابد نے میم سے بیاہ کرلیا ہے اور ماں باپ کو خرچ بھیجنا بند کر دیا ہے۔

تحصیلدارنی: (سوچ میں پڑ جاتی ہے) اجی کسی نے دشمنی میں اڑائی ہو گی۔

کچے گھر والی: بی بی ہم نے تو سنا ہے۔

تحصیلدارنی: بشیرن آج ہی تو آئی تھی۔ایسا ہوتا تو وہ ذکر نہ کرتی۔

کچے گھر والی: مگر بشیرن خالہ کو پتہ ضرور ہوگا۔وہ نہ کہیں یہ اور بات ہے۔

[وقفہ۔تحصیلدارنی سوچ میں پڑ جاتی ہے۔پھر ایک ساتھ جھرجھری لیتی ہے]

تحصیلدارنی: ابھی بلاتی ہوں میں بشیرن کو۔اس نے مجھ سے یہ بات کیسے چھپائی۔

[بشیرن داخل ہوتی ہے]

کچے گھر والی: اللہ قسم بشیرن خالہ کی بڑی عمر ہے۔ابھی تحصیلدارنی بوا نے تمھیں یاد ہی کیا تھا۔(تحصیلدارنی کی تیوری چڑھی ہوئی ہے)

بشیرن: اری میں تو ابھی یہیں بیٹھے بیٹھے گئی تھی۔گھر گئی تو میں نے سوچا کہ توا چولہا اب کون کرے۔تندور پہ روٹی پکوا لاؤں۔تو تندور پہ آٹا دیا سوچا کہ اب کہاں یہاں بیٹھی رہوں تحصیلدارنی بوا کے پاس جا بیٹھوں۔تو کب آئی؟

کچے گھر والی: ابھی آئی ہوں بس ایک پان کھایا ہے ابھی۔

تحصیلدارنی: (پاندان کھولتے ہوئے) اب بشیرن آ گئی ہے۔لے اور پان لگاتی ہوں تیرے لیے۔

کچے گھر والی: چلو ایک پان بشیرن خالہ کے صدقے میں بھی کھالیں۔

تحصیلدارنی: (تیوری پہ بل ڈالتے ہوئے) بشیرن تو نے مجھے عابد کے بیاہ کی بات نہیں بتائی۔

بشیرن: (چکرا کر) عابد کا بیاہ۔کیسا بیاہ؟

تحصیلدارنی: سنا ہے کہ عابد نے بیاہ کرلیا ہے۔

بشیرن: عابد تو امریکہ میں ہے۔

تحصیلدارنی: بیاہ کرنے والے امریکہ میں بھی بیاہ کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہاں اس نے کسی میم سے

بیاہ کرلیا ہے۔

بشیرن: (سوچ میں پڑ جاتی ہے) میں نے تو یہیں آ کے یہ خبر سنی ہے۔

تحصیلدارنی: نیم والی نے تجھے نہیں بتایا؟

بشیرن: نہیں۔ (سوچتے ہوئے جھرجھری لیتی ہے) اجی میں تو جانوں کہ کسی نے دشمنی میں اڑائی ہے۔

تحصیلدارنی: بی بی بے بات کی بات تو نہیں اڑتی۔ کچھ تو بات ہوگی ہی۔

بشیرن: اجی اڑانے والے تو ایسی اڑا دیتے ہیں جس کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور عابد کا تو پچھلے ہی ہفتے خط آیا تھا اس میں تو کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔

تحصیلدارنی: (نیم شک کے لہجہ میں) پھر کسی نے شاید دشمنی اڑائی ہوگی۔

بشیرن: (اعتماد کے ساتھ) اور کیا۔ نیم والی آپا تو خود بار بار اسے لکھ رہی ہیں کہ بیٹے شادی کر لے۔ سچی بات ہے اسے بہن سے بہت محبت ہے۔

کچے گھر والی: ہاں یہ تو محبت ہی کی بات ہے ویسے تو عابد کی عمر اچھی خاصی ہوگئی ہے۔ شادی ہوگئی ہوتی تو آج بچوں کا باپ ہوتا۔

بشیرن: مگر نیم والی آپا اب اسے چھوڑے گی نہیں۔ شمیم سے فارغ ہوتے ہی اسے باندھیں گی۔

کچے گھر والی: لیکن بشیرن خالہ کیا پتہ ہے وہ امریکہ میں ہی بندھ گیا ہو۔

بشیرن: عابد بہت سعادت مند بیٹا ہے۔ ان لڑکوں میں سے نہیں ہے جو باہر جاتے ہیں اور میمیں ساتھ لے آتے ہیں۔ دشمنی میں ایسے کوئی بدنام کردے تو اور بات۔

تحصیلدارنی: لوگوں کو بدنام کرنے میں بھلا کیا مزہ آتا ہے؟

بشیرن: تحصیلدارنی بوا لوگوں سے کسی کی آسودگی دیکھی نہیں جاتی۔ نیم والی آپا سے تو بیبیوں نے ایسی دشمنی باندھی ہے کہ کسی کل چین نہیں لینے دیتیں۔ اور بعض بیبیوں نے تو یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ ادھر کی باتیں اور ادھر کی بات ادھر۔ دوسرے کی بیٹے بیٹی میں کیڑے ڈالنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔

کچے گھر والی: (گرما کر) بشیرن خالہ یہ تم کسے کہہ رہی ہو؟

بشیرن: میں تو کسی کو نہیں کہہ رہی۔ مگر یہاں نشیب ہو گا وہاں پانی گرے گا۔

کچے گھر والی: (لہجہ اور تیز ہوتا ہے) میں بے عقل ہوں ایسے اشارے خوب سمجھتی ہوں۔

بشیرن: بی بی تجھے کون بے عقل کہے گا۔ تو تو اڑتی چڑیا کو پکڑتی ہے۔

کچے گھر والی: اور آگے کہو کہ آسمان میں تھگلی لگاتی ہے۔

بشیرن: خیر میں نے تو یہ نہیں کہا۔ تو خود ہی کہہ رہی ہے۔

کچے گھر والی: نہ میں صاف صاف کہے دیتی ہوں میں کسی وکیل نہیں ہوں۔ ایک کہو گی تو سو سناؤ گی۔ اور میں کیوں نیم والی آپا کے خلاف باتیں کرتی۔ مگر جو بات ہوتی ہے وہ تو کہی جاتی ہے۔

بشیرن: مگر تو تو جو بات نہیں ہوتی وہ بھی کہتی ہے۔

کچے گھر والی: (چلا کر) دیکھ رہی ہو تحصیلدارنی بوا۔ بشیرن خالہ پنجے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ میں نے تمہاری پلاؤ کی رکابی میں کونسی لات ماردی تم جُگ جُگ بیاہ کراؤ اور پلاؤ زردے کھاؤ۔ مجھے کیا۔ مگر مجھے کیوں تُہمتیں لگاتی ہو۔

تحصیلدارنی: اے ہے تم نے تو یاں آ کے لڑنا شروع کر دیا۔

بشیرن: میں تو چپ بیٹھی ہوں یہی لڑنے پہ تلی بیٹھی ہے۔

کچے گھر والی: تم نے یہ کیوں کہا کہ جو بات نہیں ہوتی وہ بھی تو کہتی ہے (سنبھل کر بیٹھتی ہے) بتاؤ

میں کیا کہا؟

بشیرن: تو نے یہ کہا کہ نیم والی آپا کے گھر تو سوکھی لڑکی ہے۔

کچے گھر والی: اوّل تو میں نے یہ کہا نہیں۔ اور کہا بھی ہو تو کیا جھوٹ کہا۔

بشیرن: وہ باپ بھیوں والی ہے۔ سوکھی لڑکی کیسے ہو جائے گی۔

کچے گھر والی: خیر نائی نائی بال کتنے کہ ججمان اگے آئے جاتے ہیں (نائی نائی بال کتنے ججمان جی آگے آتے ہیں) تو اب تو بیاہ ہو ہی رہا ہے۔ پتہ چل جائے گا کہ کتنا جہیز چڑھا ہے۔

بشیرن: ہاں وقت آنے دو دنیا دیکھ لے گی کہ باپ بھیوں نے بیٹی کو کیا دیا۔

کچے گھر والی: اس وقت کیوں دنیا دیکھے بھئی قاعدہ تو یہ ہے کہ بیٹی والے پہلے بیٹے والے کو بتا دیتے ہیں کہ ہم کیا دیں گے تاکہ وقت پہ جھگڑا فساد نہ ہو۔ کیوں تحصیلدارنی بوا۔

تحصیلدارنی: بی بی لڑنا بھڑنا تو مجھے آتا نہیں۔ اور نہ میں ان میں سے ہوں جو پہلے شرطیں طے کرتی ہیں کہ جہیز میں یہ یہ آنا چاہیے مگر بی بی مجھے اور کیا دیکھنا رہا۔ یہی ایک بچہ ہے تو میں تو یہ چاہوں ہوں کہ میری ساری حسرتیں پوری ہوں۔

کچے گھر والی: خدا تمہارا بھلا کرے یہی میں کہہ رہی ہوں۔

بشیرن: (کھڑے ہوتے ہوئے) تحصیلدارنی بوا جہیز کا معاملہ تو میں ابھی جا کے طے کرتی ہوں۔ تمھیں اتنا ملے گا کہ گھر بھر جائے گا۔ مگر ایک بات کہتی ہوں کہ تم برادری والیوں کے بھرے میں آ ؤ گی تو تمہارے بیٹے کی شادی کہیں نہ ہونے دیں گی۔

کچے گھر والی: (تیزی سے دروازے کی طرف جاتی ہے) جی یہ تم کسے کہہ رہی ہو۔ میں تمھیں یوں نہیں جانے دوں گی۔ ذرا مجھ سے آنکھیں ملا کر بات کر۔

بشیرن: (چلتے چلتے مڑتی ہے) نہ بی بی میرے چونڈے میں اتنے بال نہیں ہیں کہ تجھ سے بات کروں۔ [تیزی سے نکل جاتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا ایکٹ

[ممی اور ڈیڈی کے گھر کا ڈرائنگ روم جس کی آرائش میں اب ایک تجریدی تصویر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ممی اور ڈیڈی بیٹھے ہیں۔ چہروں سے بے اطمینانی کے آثار ہیں۔ ڈیڈی بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتے ہیں۔ممی ہاتھ میں امام ضامن کی پٹی تھامے بیٹھی ہیں۔]

ڈیڈی: (گھڑی دیکھتے ہوئے) میاں ماجد آ جاؤ۔وقت بہت کم رہ گیا ہے۔(اندر سے ماجد کی آواز آتی ہے۔۔۔۔"ڈیڈی آیا"۔۔۔۔وقفہ)

ممی: (پہلو بدلتے ہوئے) بیٹے آ جاؤ۔[اندر سے ماجد کی آواز آتی ہے "ممی آیا" داخل ہوتا ہے اس طرح سے کہ سوٹ بوٹ پہنے ہوئے اور ٹائی درست کر رہا ہے]

ماجد: (آواز دیتے ہوئے) شمیم! میرا رومال لاؤ۔

[اندر سے شمیم کی آواز آتی ہے "بھائی جان لائی" اور تیزی سے داخل ہوتی ہے اس کے ہاتھ میں ایک رومال ہے جسے تہ کر کے وہ ماجد کے کوٹ کی اوپر کی جیب میں سجاتی ہے]

ڈیڈی: (گھڑی دیکھتے ہوئے) وقت تو ہو گیا ہے میرے خیال میں انٹرویو شروع ہو چکا ہوگا۔ تم نے دیر کر دی۔

ماجد: (اپنی کلائی پر گھڑی دیکھتے ہوئے) نہیں ابھی چند منٹ ہیں بس اب پہنچا۔

[شمیم رومال سجا چکی ہے۔ممی امام ضامن لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اور کوٹ کی آستین پر باندھنے لگتی ہیں۔]

ممی: بیٹے امام ضامن بندھوا لو۔

ماجد: (کوٹ کی آستین اتارتے ہوئے) ٹھہریئے۔

[ممی امام ضامن باندھتی ہیں۔پھر ماجد کی بلائیں لیتی ہیں]

ممی: امام ضامن کی ضامنی میں دیا واسطہ رسول کا اور آلِ رسول کا۔ کامیاب واپس آؤ۔

[ماجد دروازے کی طرف چلتا ہے]

ممی: (گھبرا کر) بیٹا۔ (شمیم سے مخاطب ہو کر) اری کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔ کلام پاک لے کے آنا۔

[شمیم سٹپٹا کر اندر دوڑتی ہے اور جز دان میں بندھا کلام پاک لے کر فوراً پلٹتی ہے۔ جلدی جلدی جز دان کھولتی ہے۔۔۔اور کلام پاک ممی کو دیتی ہے]

شمیم: لیجیے۔

ممی: (کلام پاک ادب سے سنبھالتے ہوئے) اے ہے تیرے اوسان تو بالکل جاتے رہے ہیں۔ آٹے کی رکابی کہاں ہے۔

[شمیم سٹپٹا کر پھر اندر دوڑتی ہے فوراً ہی آٹے سے بھری ایک رکابی کے ساتھ آتی ہے۔ ممی کلام پاک کھول کر ماجد کے سر پہ کرتی ہے۔]

شمیم: (رکابی قریب کرتے ہوئے) بھائی جان اسے ہاتھ لگائیے۔

ماجد: (تامل کرتا ہے) کیوں؟

ممی: (آہستہ سے ڈانٹتے ہوئے) بیٹے پوچھا نہیں کرتے ہیں۔ پورا ہاتھ آٹے پر رکھو۔ اللہ رزق میں برکت دے۔

[ماجد کسی قدر تامل کے ساتھ آٹے پر انگلیاں پھیلا کر ہتھیلی رکھتا ہے اور اٹھا لیتا ہے۔ شمیم کچھ پڑھ کر اس کے چہرے پر پھونک مارتی ہے۔ ماجد کلام پاک کے سائے میں سے گزر کر دروازے سے نکل جاتا ہے۔ ڈیڈی ممی اور شمیم واپس آ کر صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں]

ممی: (دامن پھیلا کر) یا الٰہی اپنے نبی اور اس کی آل کے صدقے میرے بچے پر رحم کیجیو۔ سرخرو واپس آئے۔ اسے مولا یہ نوکری مل گئی تو میں تمہارے نام کا دونا

دلاؤں گی۔

ڈیڈی: انشاءاللہ کامیاب ہی واپس آئے گا (رک کر) ناکامی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ foreign کوالیفائیڈ ہے اور اس کام کی ٹریننگ لے کر آیا ہے۔

ممی: یہ نوکری مل جائے تو ہمارے سارے دلدر دور ہو جائیں۔

ڈیڈی: تنخواہ بہت معقول ہے اور پھر رہنے کے لیے بنگلہ۔

ممی: چپڑاسی بھی تو ہوگا۔

ڈیڈی: ایک چپڑاسی۔ چپڑاسی ہی چپڑاسی ہوں گے۔ ملازمت کیا ہے ریاست ہے۔

ممی: (اوپر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ بڑا سبب الا سباب ہے ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو دوسرا کھول دیتا ہے۔ عابد کے خط کے لیے میں دن رات اس ادھیڑ پن میں تھی کہ یا اللہ یہ گھر کیسے چلے گا۔ اور شمیم کی شادی سر پہ کھڑی ہے۔

ڈیڈی: سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

ممی: ہاں بس مل جائے۔

ڈیڈی: اجی اس ملازمت کو تو ملا ہی سمجھو۔ فارن ٹرینڈ آدمی انھیں کہاں مل جائے تھا۔ وہ تو چوم چاٹ کے رکھیں گے۔

ممی: (ٹھنڈا سانس بھر کر) عابد کو دیکھو کیسی وقت پہ دغا دی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ میم ہی کرنا ضرور کرنا مگر بہن کو تو رخصت کر لیتا۔

ڈیڈی: خیر اب اس ذکر کو جانے دو۔ ماجد کی ملازمت سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔

ممی: اس ملازمت کا تو گمان بھی نہیں تھا۔ میری شمیم کی قسمت سے غیب سے سامان ہوا ہے۔ (بشیرن داخل ہوتی ہے)

بشیرن: نیم والی آپا سلام۔

ممی: سلام بی بی۔

شمیم: بشیرن خالہ آداب۔

بشیرن: جیتی رہو بیٹی (ڈیڈی سے مخاطب ہوکر) بھائی آداب۔

ڈیڈی: (کھڑے ہوتے ہوئے) آداب بیٹھو۔

بشیرن: بھائی آپ بیٹھیں نا۔

ڈیڈی: نہیں نہیں تم بیٹھو میں تو جا ہی رہا تھا (نکل جاتے ہیں)

ممی: شمیم بیٹی۔ خالہ کو پان نہیں کھلائے گی؟

شمیم: ابھی لائی۔ (تیزی سے نکل جاتی ہے)

ممی: بی بی تمہارا ماجد آج انٹرویو دینے گیا ہے۔

بشیرن: اچھا۔ اللہ کرے سرخرو واپس آئے۔

ممی: اللہ نے چاہا تو سرخرو واپس آئے گا۔

بشیرن: اے نیم والی آپا ہم نے ایک خبر اور سنی ہے۔

ممی: (سٹپٹا کر) کیا؟

بشیرن: برامت مانیو میں نے تو سنا ہے۔ مجھے بیبیوں کے کہنے کا یقین نہیں آیا۔ میں نے کہا کہ نیم والی آپا سے پوچھ لوں۔ سنا ہے کہ عابد نے کسی میم سے شادی کر لی ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ اس نے تمہارا خرچ بند کر دیا۔

ممی: (رک کر) اجی میم سے شادی کی تو یہ ہے کہ سو میں کوئی ایک نیک بخت ایسا ہوتا ہوگا کہ امریکہ جاوے اور میم نہ لاوے۔ میم لانے کا رواج تو چل نکلا ہے۔ اور ہم تو اس سے پہلے بھی یہی دیکھا۔ خان بہادر صاحب جب ولایت گئے تھے تو انھوں نے میم سے شادی نہ کی تھی؟

بشیرن: بالکل کی تھی۔ اس کا تو ولایت سے یہاں تک شور پہنچ گیا تھا۔ وہ تو یہ کہو کہ بڑے خان صاحب اس وقت زندہ تھے اور بھئی تھے وہ زور والے لکھ بھیجا کہ گوری کھال والی کو

ساتھ لے کے آئے تو گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گا۔

ممی: تو بی بی یہ تو زمانے کی ہوا ہے۔ باقی یہ بیبیوں نے اپنی طرف سے جوڑ دیا کہ خرچ بند کر دیا۔ خرچ کیسے نہیں دے گا۔ مگر وہ سنبھل کے دے گا۔

بشیرن: اجی اور بیبیوں کو کیوں کہو ہو۔ وہ حرافہ کچے گھر والی ہے جو گھر گھر کہتی پھر رہی ہے کہ نیم والی آپا کے پوت لے گھر میں میم ڈال لی ہے اور ماں کو خرچ دینا بند کر دیا ہے۔

ممی: یہ عورت بہت کٹنی ہے اس کے آگے تو آدمی ہونٹ ہی نہ کھولے۔ ہونٹ پھڑ پھڑائے اور وہ لے اڑی۔

بشیرن: اجی نیم والی آپا میں لے تم سے کتنی بار کہا کہ اس کٹنی کے سامنے اپنی کوئی بات مت کرو۔ اور جب سے شمیم کے رستے کی بھنک اس کے کان میں پڑی ہے اس وقت سے تو وہ انگاروں پہ لوٹ رہی ہے کن سوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ ادھر کی اُدھر، اُدھر کی اِدھر تمھیں کیا خبر کہ اس نے ادھر جا کے کیا آگ لگائی ہے۔

ممی: واں جا کے اس لچی نے کیا کہا ہے۔

بشیرن: کیا بتاؤں کیا کہا ہے بس سب ہی کچھ کہا ہے۔ اس نے کان بھرنے میں کوئی کسر تھوڑا ہی چھوڑی تھی۔ وہ تو یہ کہو کہ میں وقت پہ پہنچ گئی۔ میں نے لچی کو ایسی سنائیں کہ یاد کرے گی۔

ممی: بی بی وہ تمھاری بھی دشمن ہو جائے گی۔

بشیرن: (انگوٹھا دکھا کر) ہو جائے۔ میری جوتی سے۔

ممی: مگر اس نے کہا کیا؟

بشیرن: اجی یہی کہا کہ عابد تو میم سے لگ گیا۔ ماں کو خرچ پانی دینا بند کر دیا ہے۔

ممی: (سخت غصے سے) اس کے چونڈے میں آگ لگے۔ کیا ہم خدا نہ کرے اس کی طرح غریب فقیر ہیں۔

بشیرن: یہی تو میں نے کہا تھا۔

ممی: اس کا باپ زندہ رہے۔ وہ کوئی بھیوں کی محتاج تھوڑا ہی ہے اور بھیوں کی محتاج بھی ہو تو اس کا کوئی ایک بھیا تھوڑا ہی ہے۔ اللہ رکھے ماجد کو عابد سے بڑی نوکری مل رہی ہے۔ نوکری کیا ہے ریاست۔۔۔۔

بشیرن: ویسے تو ماشا اللہ عابد کی نوکری بھی ریاست ہی ہے۔

ممی: اجی عابد کی نوکری کا تو یہ ہے کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ امریکہ میں ہے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ مگر عابد تو یہیں رہے گا۔ یہیں بیٹھ کے میں دشمنوں کے سینے پہ مونگ دلوں گی۔

بشیرن: بس اب میں تحصیلدارنی آپا کو سمجھاؤں گی۔ کچے گھر والے کی تو میں چلنے نہیں دوں گی۔

ممی: ہاں صاف صاف کہہ دیجیو کہ ہماری لڑکی گر پڑ کے نہیں آئے گی اتنا دوں گی کہ تحصیلدارنی کی پشتیں نہال ہو جائیں گی۔

بشیرن: یہی تو میں نے کہا تھا۔ ایک بھیے نے ہاتھ کھینچ لیا تو کیا ہے۔ اب دوسرا بھیا دے گا۔

ممی: اور پھر باپ کا سایہ سر پر رہے۔ پنشن ہو گی تو کیا ہوا؟ مرا ہاتھی سوالاکھ کا۔ پنشن والوں کو تو بڑی بڑی تنخواہوں کی نوکری ملتی ہے۔

بشیرن: مگر کم بخت کچے گھر والی نے تحصیلدارنی آپا کے کان میں یہ پھونک دیا ہے پہلے سے معلوم کر لو کہ جہیز میں آئے گا کیا۔

ممی: (غصے سے) اے ہے یہ کون سا دستور ہے۔ جو وقت پہ بن پڑے گا دوں گی۔ اور اللہ نے چاہا تو اتنا دوں گی کہ تحصیلدارنی آپا کو سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

بشیرن: (سمجھاتے ہوئے) خیر ہے تو یہی بات۔ مگر بھئی وہ بیٹے والی ہیں (رک کر) اور نیم والی آپا! تم نے جہیز تیار تو کر ہی لیا ہے۔

ممی: کچھ تیار کرلیا ہے۔ کچھ تیار کر رہی ہوں۔

بشیرن: تیار نہ بھی کیا ہو۔ سوچ تو لیا ہے کہ کیا دو گی؟

ممی: بی بی ایک چیز سوچ لی ہے۔

بشیرن: تو پھر بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ چلو تھوڑی دیر کے لیے وہی بڑی بن جائے۔

ممی: (رک کر) مگر بی بی مجھے منہ زبانی سب کچھ یاد تھوڑا ہی ہے۔ فرصت سے بیٹھوں شمیم اور اس کے باپ کو سامنے بٹھاؤں تو مجھے یاد آئے گا کہ کیا کیا چیز خرید لی ہے۔ اور کیا کیا خریدنی ہے۔

بشیرن: فرصت نہیں ہے تو فرصت نکال لو۔ آخر بیٹی کا معاملہ ہے۔ ایسے معاملہ کو کھٹائی میں نہیں ڈالا کرتے۔ چٹ پٹ کیا کرتے ہیں۔

ممی: مگر چٹ پٹ کیسے کروں۔

بشیرن: ایسے کرو کہ ابھی شمیم کو پاس بلا کے بٹھاؤ۔ بھائی آ جائیں تو اُن سے پوچھو اور ابھی فہرست بنوا لو۔

ممی: (کسی قدر تامل کے ساتھ) اچھا۔ مگر ہے یہ بے جابات۔

بشیرن: کوئی بے جابات نہیں ہے۔ لڑکوں والے ایسی ہی لگایا کرتے ہیں (اٹھتے ہوئے) اچھا اب میں جا رہی ہوں۔

ممی: اری بیٹھ تو سہی۔

بشیرن: (چلتے ہوئے) ابھی آؤں کی تھوڑی دیر میں۔ بس تم فہرست تیار کرا لو۔

[وقفہ۔۔۔ ڈیڈی داخل ہوتے ہیں]

ڈیڈی: ابھی ماجد میاں نہیں آئے۔

ممی: نہیں۔

ڈیڈی: اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔

ممی: اے ہے ابھی تو گیا ہے۔

ڈیڈی: ٹھیک ہے مگر انٹرویو سارے دن تو نہیں ہوگا۔

ممی: ذرا یاں آ کے اطمینان سے بیٹھو۔

ڈیڈی: (حیرت سے) کیوں خیر تو ہے؟

ممی: بیٹھو تو سہی۔ (آواز دیتی ہے) شمیم، اری شمیم۔ (ڈیڈی قریب کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ شمیم داخل ہوتی ہے۔)

شمیم: جی ممی جی۔

ممی: پنسل کاغذ لے کے ذرا میرے پاس بیٹھ۔

شمیم: (تعجب سے) پنسل کاغذ لے کے؟

ممی: ہاں پنسل کاغذ لے کے۔ (شمیم اندر جاتی ہے) (ڈیڈی سے) یہ بتاؤ جہیز کے سامان میں کیا کیا خریدا گیا ہے اور کیا کیا خریدنا باقی ہے؟

ڈیڈی: (تعجب سے) یہ اس وقت تم پہ کیا سنک سوار ہوئی ہے؟

ممی: (تنک کر) تمھیں ہر قاعدے کی بات سنک دکھائی دیتی ہے۔

ڈیڈی: ماجد کی ماں۔ ایسی عجلت کیا ہے۔ کسی وقت اطمینان سے بیٹھنا اور فہرست بنا لینا۔

ممی: نہیں اسی وقت بنے گی۔

ڈیڈی: آخر اسی وقت کیوں؟

ممی: تحصیلدرانی آپا کو بتانا ہے کہ جہیز میں ہم کیا کیا دیں گے۔

ڈیڈی: (تعجب سے) یہ کون سا دستور ہے؟

ڈیڈی (ممی): جو بیٹے والے کہہ دیں بس وہی دستور بن جاتا ہے۔

[شمیم کاغذ پنسل لیے داخل ہوتی ہے اور ممی کے قریب آ بیٹھتی ہے]

شمیم: جی؟

ممی: لکھو جہیز کے سامان میں کیا کیا آ چکا ہے (شمیم پنسل سنبھال کے کاغذ پہ جھک جاتی ہے جیسے کچھ لکھنے والی ہے۔ کوئی چیز رہ نہ جائے۔ (ڈیڈی سے) اجی بتاؤ نا۔۔۔؟

ڈیڈی: مجھے اب کیا یاد ہے۔ تم ہی یاد کرو۔

ممی: (سوچتے ہوئے) ایک تو کھانے کے برتنوں کا سیٹ آیا تھا۔

شمیم: ڈنر سیٹ؟ (لکھنے لگتی ہے مگر پھر جھجھک کر ہاتھ روک لیتی)

ممی: اری لکھ۔

شمیم: ممی وہ سیٹ تو بگڑ گیا۔

ممی: (غصے سے آنکھیں لال پیلی کر کے) بگڑ گیا، کیسے بگڑ گیا؟

شمیم: (تامل کے ساتھ) کئی پلیٹوں کے کنارے جھڑ چکے ہیں اور ایک ڈونگے کا ڈھکن ٹوٹ گیا۔

ممی: ڈھکن ٹوٹ گیا؟ کیسے ٹوٹ گیا؟ بیٹی وہ سیٹ تو پیٹی میں بند رکھا تھا۔

شمیم: نہیں ممی۔ وہ نکل آیا تھا۔

ممی: (غصے سے) کب نکل آیا تھا۔

شمیم: انہی دنوں جب بھائی جان کے دوست کراچی سے آئے تھے تو کھانے کے لیے وہ سیٹ نکالا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد جب کبھی باہر والوں کا کھانا ہوا وہی برتن استعمال میں آتے تھے۔

ممی: (ماتھے پر ہتھیلی مار کے) تقدیر۔ (وقفہ۔ پھر غصے میں آ کر) تو نے کس سے پوچھ کر نکالا تھا۔؟

شمیم: (ڈرتے ڈرتے) بھائی جان نے کہا تھا کہ نیا سیٹ نکالو۔ میں نے نکال لیا۔

ممی: (خاموش رہتی ہیں۔ پھر چونک کر) اس پیٹی میں کافی سیٹ بھی رکھا گیا تھا۔

ڈیڈی: وہ ہی سیٹ تو اب میلا ہو گیا ہے۔

ممی: میلا ہو گیا ہے۔۔۔وہ کیسے؟ (ڈیڈی اور شمیم دونوں خاموش رہتے ہیں۔) اری میں پوچھ رہی ہوں کیسے میلا ہو گیا؟

شمیم: ممی وہ سیٹ تو اسی دن آپ کے سامنے نکل آیا تھا۔

ممی: کب نکل آیا تھا؟

شمیم: آپ نے تو اس میں کافی پی تھی۔

ڈیڈی: خیر برتنوں کے متعلق پھر سوچنا۔ باقی اور کون کون سی چیز آئی تھی۔

ممی: (سوچتے ہوئے) ایک سنگھار میز بھی تو آئی تھی۔ (شمیم چپ بیٹھی رہتی ہے) اری لکھ!

شمیم: ممی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں تو بال پڑ گیا ہے۔

ممی: (غصے سے) بال پڑ گیا۔ کیسے پڑ گیا۔؟

شمیم: وہ بھائی جان کے کمرے میں رکھی تھی۔ زاہد کے بچے نے شاید کچھ کیا تھا۔ وہی اس کمرے میں بھائی جان کی غیر حاضری میں گھس گھس کے جایا کرتا تھا۔

ممی: (غصے سے) وہ کباڑیا گھر کی کوئی چیز سلامت نہیں رہنے دے گا۔

[موٹر کے ہارن کی آواز۔ رکنے کی آواز]

ممی: (چونک کر) ماجد آ گیا۔ [ممی، ڈیڈی اور شمیم تینوں بے چین ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ ماجد موٹر کی چابی انگلی میں گھماتا داخل ہوتا ہے) بیٹے کیا ہوا؟

ماجد: ممی! میں نے آفر reject کر دی۔

ڈیڈی: (تشویش سے) reject کر دی۔ کیوں؟

ممی: اے نا بیٹے۔

ماجد: ہاں ممی سچ کہہ رہا ہوں۔ نا قدرے لوگ ہیں۔

ڈیڈی: کیا کہتے ہیں؟

ماجد: کہتے ہیں اسسٹنٹ لگ جاؤ۔

ڈیڈی: تنخواہ تو اسسٹنٹ کی بھی اچھی ہوگی۔

ماجد: ڈیڈی یہ سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ پروجیکٹ ڈائرکٹر کی کوئی فارن کوالیفیکیشن نہیں ہے۔ پاکستان ہی کا ٹرئینڈ ہے۔ میں اس کے under کیسے کام کرسکتا ہوں۔

ممی: بیٹا۔ مطلب تو آم کھانے سے ہے نہ کہ پیڑ گننے سے۔

ماجد: (غصے سے) ممی یہ نئی situation ہے اسے آؤٹ آف ڈیٹ محاوروں سے نہیں سمجھا جاسکتا۔

ممی: (ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے) اچھا بیٹے جو تم کہتے ہو سچ کہتے ہو۔

[ماجد اندر چلا جاتا ہے۔ ممی، ڈیڈی اور شمیم تینوں خاموش اور فکر مند بیٹھے ہیں۔ وقفہ۔ زاہد داخل ہوتا ہے۔ ممی کے پاس آ کر بیٹھتا ہے۔ پھر فوراً ہی اٹھ کر ریڈیوگرام کی طرف جاتا ہے۔ ایک انگریزی ریکارڈ چڑھاتا ہے۔ اس دھن پر ٹوسٹ شروع کر دیتا ہے۔ شمیم توجہ سے اس کا ٹوسٹ دیکھنے لگتی ہے۔ ممی خلا میں تکتی رہتی ہیں۔ پھر زاہد کو ٹوسٹ کرتے دیکھ کر جھنجھلا جاتی ہیں]

مٹے زنحے اب تو نچلا نہیں بیٹھے گا۔

[زاہد ناچتے رک جاتا ہے]

پڑھنا نہ لکھنا۔ جب دیکھو ناچ۔ جب دیکھو ناچ۔ یہ نیا لچھن پکڑا ہے اور کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے۔ نہ باپ نہ بھیا۔

[زاہد چپکے سے شمیم کے برابر بیٹھتا ہے]

اس نے بھی سمجھ لیا ہے کہ باپ اور بھیا کچھ کہتے نہیں ہیں۔ ماں چلاتی رہتی ہے تو اس کا کیا ہے۔ چلا چلا کے خود ہی تھک جائے گی۔ اور چپ ہو جائے گی۔ [ریکارڈ بجے جا رہا ہے ریڈیوگرام کی طرف برا سا منہ بنا کر دیکھتی ہیں پھر شمیم سے مخاطب ہوتی ہیں۔]

اری یہ کیا اتنی دیر سے ٹین سا بجے جا رہا ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ میرا دل

ویسے تو اہو رہا ہے۔ اسے بند کر۔ [شمیم اٹھ کر ریڈیو گرام بند کرتی ہے] جا ذرا ہنڈیا دیکھ لے۔ میرا دل تو اس وقت قابو میں نہیں ہے۔

[شمیم نکل جاتی ہے۔ وقفہ۔ ممی اور ڈیڈی دونوں خاموش بیٹھے ہیں۔ ممی پھر بول اٹھتی ہیں۔] (ڈیڈی سے) ڈاخانے میں اب کتنی رقم ہے۔

ڈیڈی: (اخبار الگ رکھتے ہوئے) حساب لگا لو کہ پچھلے مہینے میں بنک سے کتنی رقم نکلی ہے۔ خود پتہ چل جائے گا کہ کتنے پیسے باقی ہیں۔

[اخبار اٹھاتا ہے اور کھول کر اس طرح پڑھنا شروع کرتا ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی ہیں اور اخبار منہ کے آگے ہے۔]

ممی: نا آخر کتنی رقم باقی ہے؟

ڈیڈی: باقی کا کیا سوال؟

ممی: (غصے اور حیرت سے) باقی کا کیا سوال ہے۔۔۔ اجی ہوش کی دوا لو۔ کیا ڈاخانہ خالی ہو گیا۔

ڈیڈی: اور نہیں تو بھرا ہوا ہے۔

ممی: اجی آخر جھاڑو تو نہیں مل گئی۔ کچھ رقم تو باقی ہوگی۔

ڈیڈی: ہاں جی سو، سوا سو کے لگ بھگ تو رقم ہونی چاہیے۔

ممی: (سکتے میں آجاتی ہے) سو، سوا سو

ڈیڈی: اس سے زیادہ تو نہیں ہیں۔

ممی: (چیخ کر) باقی رقم کہاں بہہ گئی؟ (زاہد اخبار سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ پھر اخبار منہ کے آگے کر لیتا ہے)

ڈیڈی: باہر تو نہیں بہا آیا۔ (ساز و سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہیں گھر میں بہہ رہی ہے۔

ممی: میں نے تم سے کتنا کہا تھا کہ ڈاخانے میں سے کوڑی نہیں نکالیے گا۔ یہ سب شمیم کے
بیاہ کے لیے ہے۔

ڈیڈی: میں نے اپنی مرضی سے تو دمڑی نہیں نکالی۔ ماجد کے کہنے پر تم کہتی گئیں۔ میں چیک پہ
دستخط کرتا چلا گیا۔

ممی: (چیخ کر) میں کہتی گئی۔اے خدا کے غضب سے ڈرو۔

[ماجد داخل ہوتا ہے۔اس نے کوٹ اتار دیا ہے۔ ہاتھ میں انگریزی اخبار ہے۔]

ماجد: (متانت سے) ممی آخر مسئلہ کیا درپیش ہے؟

ممی: (جلے بھنے لہجے میں) اے بیٹا ساری زلیخا پڑھ لی اور یہ پتہ نہ چلا کہ زلیخا مرد تھی یا
عورت؟

ماجد: (متانت مگر تھوڑی برہمی کے ساتھ) ممی میں آپ کے یہ آؤٹ آف ڈیٹ محاورے
سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں نے آپ سے ڈائریکٹ سوال کیا ہے کہ مسئلہ کیا ہے؟

ممی: (درد بھرے لہجہ میں) بیٹے سب سے بڑا مسئلہ تو بیٹی ہوتی ہے۔

ماجد: میں نہیں سمجھا۔

[زاہد اخبار رکھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور باہر نکل جاتا ہے)

ممی: اسے ٹھکانے لگانا نہیں ہے؟

ماجد: اس میں قباحت کیا ہے؟

ممی: قباحت ہی نہیں ہے۔ پیام سلام ہو گئے۔تاریخ طے ہونے والی ہے۔۔۔۔۔[یہاں
پر ایک سطر قابل قرأت نہیں]

ماجد: پلیز بو جان۔ آؤٹ آف ڈیٹ محاورے مسئلہ کا حل نہیں ہیں۔ سیدھی سیدھی بات
کریں پیسہ کس لیے؟

ممی: (ناک پر ہاتھ رکھتے ہوئے) اے لو اور سنو۔ پیسہ کس لیے؟۔۔۔ بیٹے جہیز کے لیے۔

ماجد: (تحقیر آمیز لہجہ میں) جہیز کے لیے؟۔۔۔کیسا جہیز؟

ڈیڈی: (جلدی سے بات پکڑتے ہوئے) بالکل، بالکل ٹھیک سوال کیا۔ جہیز کیسا؟

ممی: اے لو یہ پنوں سے زیادہ سٹے ہو گئے۔ اجی تمھاری مت ماری گئی ہے۔

ڈیڈی: ماجد کی ماں۔

ماجد: (بات کاٹتے ہوئے) پلیز ڈیڈی۔ ماجد کی ماں آپ کی زبان سے اچھا نہیں لگتا۔

ڈیڈی: میرا مطلب ہے کہ بیگم۔۔۔۔

[بشیرن داخل ہوتی ہے۔ ڈیڈی بات کرتے کرتے رک جاتے ہیں۔ ماجد جلدی سے اٹھ کر چلا جاتا ہے۔]

بشیرن: بھائی آداب!

ڈیڈی: (کھڑے ہوتے ہوئے) آداب بیٹھو۔

بشیرن: میرے آنے سے بھائی کو بہت بے آرامی ہوتی ہے۔

ڈیڈی: بے آرامی کی کیا بات ہے۔ میں تو اٹھ ہی رہا تھا (اندر چلے جاتے ہیں)

بشیرن: (بیٹھتے ہوئے) میں نے ماجد کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ انٹرویو سے آ گیا۔

ممی: (مری ہوئی آواز میں) انٹرویو دے آیا ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔

بشیرن: اللہ نے چاہا تو سرخرو ہوگا۔ (وقفہ) پھر نیم والی آپا تم نے کیا سوچا؟

ممی: (رک کر) بی بی میرا سوچنا کیا ہے۔ سوچنا تو بیٹے والوں کا ہے۔

بشیرن: نہیں آپا۔ سوچنا بیٹی والوں کا ہوتا ہے آخر تم نے سوچا ہی ہوگا کہ بیٹی کو کیا دوگی۔ وہی بتا دو۔

ممی: میں نے شمیم سے کہا تھا کہ بیٹی ذرا فہرست تو بنا دو۔ وہ ڈوبی گھر کے دھندے میں ایسی لگی ہے کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے سر اٹھانے کا وقت نہیں ملتا۔

بشیرن: اجی فہرست وہرست کیا بنوانی ہے تم مجھے زبانی بتا دو۔

ممی: بی بی تمھیں پتہ ہے کہ مجھے کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی ۔ جہیز ادھر رکھتی ہوں ادھر بھول جاتی ہوں ۔ میں نے سوچا تھا کہ عابد ماجد کے باپ کو بٹھا کے پوچھوں کہ کیا کیا جہیز خریدا گیا ہے۔

(وقفہ۔۔ممی خاموشی سے پاندان کھولتی ہیں اور پان لگانا شروع کر دیتی ہے)

بشیرن: بھائی ابھی یہیں تو تھے۔انھیں بٹھا کے طے کرلیا ہوتا۔

ممی: بی بی ہتھیلی پہ تو سرسوں نہیں جمتی۔ایسے کام تو ہوتے ہوتے ہی ہوتے ہیں۔

بشیرن: اجی نیم والی آپا۔ میں کہہ رہی ہوں کہ ڈھیل مت ڈالو سو دوست ہیں سو دشمن ہیں۔اور کچے گھر والی روز ایک فتنہ کھڑا کرتی ہے۔ جو کام کرنا ہے چٹ پٹ کرو۔ لیت و لعل کرو گی تو بیٹی کا معاملہ ہے۔جانے کیا بات اٹھ کھڑی ہو اور کھنڈت پڑ جائے۔تو میری تو یہ رائے ہے کہ بھائی کو آج ہی پاس بٹھا کے یہ طے کرلو۔

ممی: (خاموش پان لگاتی رہتی ہیں۔ پھر رک کر) ان سے میں نے ذکر کیا تھا مگر وہ تو جہیز کے خلاف ہیں اور پھر یہ کہ پہلے سے بتایا جائے کہ کیا دیا جائے۔ یہ سن کر تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

بشیرن: اے ہے اس میں تن بدن میں آگ لگنے کی کیا بات ہے۔ اور جہیز تو بیٹی کو دیا ہی جاتا ہے۔

ممی: بی بی ہمارے گھر تو سوکھی لڑکی ہے۔

بشیرن: (ممی کا منہ تکنے لگتی ہے) اجی نیم والی آپا کیا کہہ رہی ہو۔کوئی غیر یب فقیر نہ کہے تو الگ بات ہے۔مگر حیثیت والوں کو تو ایسی بات زیب نہیں دیتی۔

ممی: اے بی بی حیثیت کی بات تو یہ ہے کہ اب بڑی بڑی حیثیت والے ایک انگوٹھی پہن (پہنا) کے بیٹی کو رخصت کر دیتے ہیں۔[پان بنا کر پیش کرتے ہیں]

بشیرن: (پان منہ میں رکھتے ہوئے) [افسوس کے لہجے میں] نیم والی آپا! کیا کہہ رہی

ہو۔ بہت اچھا لونڈا تھا۔ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

ممی: اجی لڑکی کی قسمت اچھی ہو۔ برا لڑکا بھی اچھا بن جاتا ہے۔ قسمت بری ہو تو اچھے بھی برے بن جاتے ہیں۔

بشیرن: ہاں یہ تو سب قسمت کے کھیل ہیں۔ قسمت میں نہ ہو تو آپا لڑکا اپنی ہی بیوقوفی سے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ (چپ ہو جاتی ہے)

[وقفہ۔ بشیرن ممی دونوں چپ بیٹھی رہتی ہیں۔ ممی سرد لہجے سے چھالی کرے جا رہی ہے۔]

بشیرن: (کھڑے ہوتے ہوئے) اب میں چلوں گی۔

ممی: (اس طرح چھالیہ کاٹتے ہوئے) (اداس لہجے میں) اچھا۔

بشیرن: (چلی جاتی ہے۔ وقفہ۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

ممی: ارے زاہد۔ دیکھ ذرا کون ہے؟

[زاہد تیزی سے داخل ہوتا ہے۔ پھر باہر کے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ لفافہ ہاتھ میں لیے واپس آتا ہے]

زاہد: (آواز دیتے ہوئے) بھائی جان! آپ کی رجسٹری۔

[ماجد داخل ہوتا ہے۔ زاہد سے لفافہ لیتا ہے۔ اسے کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ پڑھتے پڑھتے صوفے پر بیٹھتا ہے۔ ڈیڈی داخل ہوتے ہیں۔]

ڈیڈی: (تجسس آمیز نظروں سے ماجد کو دیکھتے ہوئے) کیسی رجسٹری ہے؟

[ماجد بدستور پڑھنے میں مصروف رہتا ہے۔ شمیم داخل ہوتی ہے]

شمیم: بھائی جان کیسی رجسٹری ہے؟

ماجد: (بڑبڑاتے ہوئے) کمال اتنا شارٹ نوٹس؟

ڈیڈی: (تشویش سے) کیسا نوٹس؟

ماجد: کار کی کچھ پچھلی قسطیں ادا ہونی تھیں۔

ڈیڈی: (تعجب سے) پچھلی قسطیں اور ابھی اس دن تو تم رقم لے کر گئے تھے۔

ماجد: وہ تو ایک قسط کی رقم تھی۔ اس سے پہلے بھی تو کچھ قسطیں باقی تھیں۔

ڈیڈی: (سوچ میں پڑ جاتے ہیں) تعجب ہے۔ تم تو رقم مجھ سے لیتے رہے ہو۔

ماجد: ٹھیک ہے لیتا رہا ہوں مگر آخر کو۔۔۔۔۔[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں] کرنا تھا میں نے سوچا کہ قسطیں پھر ادا ہو جائیں گی۔ (وقفہ۔۔سب اپنی اپنی جگہ خاموش ہیں)

ڈیڈی: پھر؟

ماجد: یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟

ڈیڈی: میعاد بڑھ سکتی ہے؟

ماجد: مشکل ہے۔

ڈیڈی: پھر کیا صورت ہو سکتی ہے۔ بنک میں تو اب کچھ نہیں رہا۔ عابد نے ہاتھ کھینچ لیا (سوچ میں پڑ جاتے ہیں)

[وقفہ۔ شمیم آہستہ سے اندر چلی جاتی ہے۔]

ماجد: بڑبڑاتا ہے) برے وقت میں نوٹس آیا۔

ڈیڈی: (ممی سے مخاطب ہو کر) سنا تم نے؟

ممی: (تلخ اور اداس لہجہ میں) سن لیا۔

ڈیڈی: کیا کیا جائے۔

ممی: میں کیا بتاؤں۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو جاتی ہیں)

[وقفہ۔ ممی چھالیا کتر رہی ہیں اور دیوار تک رہی ہیں۔ میز پر پڑا ہوا اُردو اخبار ورق ورق بکھر کر اڑنے لگتا ہے۔ زاہد اسے سمیٹ کر میز پر رکھتا ہے۔ شمیم ہاتھ میں زیور کا

لمبا سا ڈبہ لیے داخل ہوتی ہے۔ ماجد کے پاس پہنچ کر خاموشی (سے) اس کی طرف بڑھا دیتی ہیں۔ ماجد خاموشی سے اور ممی پریشان ہو کر اسے دیکھتی ہیں]

ڈیڈی: (تھکے ہوئے لہجے میں) باقی جہیز تو پہلے ہی تتر بتر ہو گیا تھا چار زیور پڑے رہ گئے تھے انھیں بھی بہادے۔

[شمیم نہ جواب دیتی ہے نہ ممی کی طرف دیکھتی ہے۔ ڈبہ بالکل ماجد کے آگے کر دیتی ہے۔ ماجد ڈبے کو دیکھتا ہے شمیم کو دیکھتا ہے تذبذب میں رہتا ہے پھر ڈبہ لے لیتا ہے۔ وقفہ۔ ماجد ڈبہ لے کر اندر کمرے میں جاتا ہے پھر کوٹ پہنے ڈبہ لیے واپس آتا ہے۔]

ماجد: ڈیڈی آپ چلیں گے

ماجد: کسی جیولر سے بات کر لیں۔

ڈیڈی: (سوچ کر) بیٹا تم ہی جاؤ۔ (ماجد چلا جاتا ہے)

ممی: خدا کو یہی منظور تھا (لمبا ٹھنڈا سانس بھر کر خاموش ہو جاتی ہیں۔)

[سب خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ موٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز۔ سٹارٹ ہوتی ہے اور رک جاتی ہے۔ ڈیڈی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کسی سے نظریں ملائے بغیر اندر چلے جاتے ہیں۔ ممی چھالیا کترتی رہتی ہیں۔ دیوار کو تکتی رہتی ہیں۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرتی ہیں سروتہ تھالی میں رکھ کر پاندان بند کر کے اندر چلی جاتی ہیں۔

[زاہد ریڈیو گرام پر ایک انگریزی دھن کا ریکارڈ لگا کر ٹوسٹ شروع کر دیتا ہے، موٹر سٹارٹ ہو کر پھر رک جاتی ہے۔ شمیم سب طرف سے بے خبر دیوار کو تکے جا رہی ہے۔ ایک لٹ اس کے منہ پر آپڑی ہے۔ اُردو کا اخبار ورق ورق ہو کر پھر کمرے میں بکھر گیا ہے۔ موٹر یکا یک سٹارٹ ہوتی ہے اور چل پڑتی ہے۔ ہارن کی آواز جو دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ شمیم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیتی ہے جیسے سسکیاں لے رہی ہو۔ ریکارڈ کی دھن پر زاہد کا ٹوسٹ جاری ہے۔۔۔] (پردہ گرتا ہے)

بھنور

ابسن کے کھیل Wild Duck

سے ماخوذ

تحریر انتظار حسین

مئی ۱۹۹۳ء

ہدایات: سلمان شاہد

پہلا منظر

[شام کا وقت ۔ ایک بڑا سا کمرہ جس میں ایک گوشے میں کیمرہ اور دوسرا ایسا سامان نظر آ رہا ہے کہ جیسے ایک فوٹو گرافر کے سٹوڈیو کا نقشہ پیش کر رہا ہو۔ اس سے ہٹ کر معمولی صوفے میز اور کرسیاں، گویا یہ سٹوڈیو بھی ہے اور کامن روم بھی، سٹوڈیو والے حصے میں ایک بڑی میز ڈائنگ ٹیبل کی قسم کی بچھی ہوئی ہے جس پر تصویریں اور نیگٹو وغیرہ پھیلے ہوئے ہیں۔ فوٹو گرافی سے متعلق کچھ دوسرا سامان ۔ ایک نوجوان وہاں بیٹھا تصویروں پر کام کر رہا ہے عقب میں ایک دروازہ جو احاطہ میں کھلتا ہے یہاں سے کبھی کبھی کسی پرندے کے بولنے اور پھڑ پھڑاہٹ کی آواز آتی ہے دائیں بائیں دو دروازے نظر آتے ہیں ایک دروازہ سامنے ہے جو برآمدے میں کھلتا ہے باہر سے آنے والے اسی راستے سے آتے جاتے ہیں ۔ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے نوجوان جس کا نام اطہر ہے تصویروں سے نظر اٹھا کر سامنے دروازے کی طرف دیکھتا ہے۔]

اطہر: (کسی قدر اونچی آواز میں) اندر آجائیے۔

[ایک نوجوان کم و پیش اسی کی عمر کا داخل ہوتا ہے جس کے حلیے اور چال ڈھال سے لباس اور مجلسی ادب آداب سے لاپرواہی کی غمازی ہوتی ہے اس کا نام جاوید ہے]

جاوید: ہیلو اطہر۔

اطہر: (غور سے دیکھتا ہے اور ایک ساتھ خوشی سے کھڑا ہو جاتا ہے) ابے جاوید ابے یار تو کہاں سے آن ٹپکا۔ (بڑھ کر ایک دوسرے کو گرمجوشی سے گلے ملتے ہیں) خط نہ پتر۔ میں تو سمجھا تھا کہ کہیں مر کھپ گیا ہوگا۔

جاوید: ڈھیٹ ہوں۔ اتنی آسانی سے تو دنیا نہیں چھوڑوں گا۔

(دونوں ہنستے ہیں)

اطہر: ویسے غنی انکل نے پچھلے دنوں کچھ اشارتاً کچھ ذکر کیا تھا کہ جاوید کو میں نے لکھا ہے آنے والا ہے۔ میں نے سمجھا کہ غنی انکل بس اپنے دل کو سنبھانے کے لیے بات کر رہے ہیں۔لیکن یار تو تو سچ مچ آ گیا۔ ونڈرفل بہت اچھا کیا۔

جاوید: اچھا کیا یا برا کیا یہ تو اب پتہ چلے گا۔

اطہر: نہیں یار ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا۔ مٹی ڈالو۔ زندگی ظالم چیز ہے آدمی کو بہت کچھ بھلانا پڑتا ہے۔

جاوید: (مسکرا کر) ابے تو تو بالکل ناصح مشفق بن گیا یہ تجھے میرے بعد ہوا کیا۔

اطہر: (ٹھنڈی سانس بھر کر) آدمی کو ٹھوکریں لگیں تو اسے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے تو بیٹا زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے تجھے بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا ہوگا۔تو پیارے اب تو سیدھے سبھاؤ راہ پہ آجا۔

جاوید: اچھا چھوڑ اس قصے کو یہ باتیں بعد میں ہوں گی پہلے اپنا حال سنا۔ (غور سے سر سے پیر تک دیکھتے ہوئے) یار تو کچھ موٹا نہیں ہو گیا ہے۔

اطہر: میں تجھے موٹا نظر آرہا ہوں۔ حد ہے یار، میاں اپنا کباڑا ہو گیا ہے اور تو کہتا ہے کہ میں

موٹا ہو گیا ہوں (جاوید کو دیکھتے ہوئے) ویسے استاد تم واقعی موٹے نہیں ہو (معنی خیز انداز) کیا بات ہے کوئی چکر چل گیا ہے۔

جاوید: چکر وکر کوئی نہیں چلا۔ بس ہم چکر میں ہیں۔

اطہر: وہ خیر پتہ ہے تجھ جیسے گھن چکر کے ساتھ اور کیا ہونا ہے کوئی نہ کوئی چکر جان کو لگائے رکھتا ہے۔

جاوید: اچھا یار اپنی سناؤ ہو کیا رہا ہے۔

اطہر: فوٹو گرافری کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔

جاوید: ابے فوٹو گرافر بن گیا ہے گڈ۔

اطہر: کالج تو بیچ میں ہی چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ جو حالات پیدا ہو گئے تھے اُن کا تو تمھیں پتہ ہی ہوگا۔

جاوید: (سنجیدگی سے) ہاں مجھے پتہ چلا تھا کہ تم لوگوں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔

اطہر: ان حالات میں تعلیم کیسے جاری رہ سکتی تھی فاقوں کی نوبت آ گئی تھی سوچا کہ کوئی دھندا کر کے اتنا تو کر لیا جائے کہ پیٹ بھرنے کا سامان ہو جائے آخر غنی انکل نے مدد کی۔

جاوید: (چونک کر) کس نے؟

اطہر: غنی انکل نے اور کس نے۔ انھوں نے تمھیں نہیں لکھا۔

جاوید: نہیں۔ لکھتے بھی تو کیا میں یقین کر لیتا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اطہر: یار ہم تو پھانک تھے۔ فوٹو گرافی کے کھڑاک کے لیے جیب میں دھیلا نہیں تھا سب انتظام انھوں نے ہی کیا۔

جاوید: میرا باپ تو کسی پہ کوڑی خرچ نہ کرے تجھ پہ کیسے مہربان ہو گیا۔

اطہر: یار تو نے اپنے ڈیڈی کو سمجھا ہی نہیں۔ بغاوت کا بھوت جو سر پہ سوار تھا۔ انکل نفیس آدمی ہیں تجھے پتہ ہے کہ میری شادی کا سارا انتظام بھی انھوں نے ہی کیا تھا۔

جاوید: (اچھل کر) ابے تو نے شادی کر لی۔ گڈ۔ ویری گڈ۔

اطہر: بس یہ بھی اپنے انکل غنی کی عنایت تھی۔ ورنہ ان حالات میں شادی۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

جاوید: (حیرت سے) تعجب ہے۔ میرا باپ میرے جانے کے بعد اتنا شریف ہو گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بغاوت نے اس پر اچھا اثر ڈالا۔ اچھا خیر یہ بتاؤ کہ ہماری بھابھی کون۔ کوئی بہت ہی معصوم ہو گی کہ اس نے تجھ جیسے فضول آدمی سے شادی کرنا منظور کر لیا۔

اطہر: ہاں میں تو بالکل پھانک تھا جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی پتہ نہیں انکل غنی نے اس کے سامنے میری کتنی ہوا باندھی کہ بس کچے دھاگے سے کھنچی چلی آئی۔

جاوید: کون ہے وہ یار؟

اطہر: (مسکرا کر) تم اسے جانتے ہو۔

جاوید: (سوچتے ہوئے) نام بتاؤ۔

اطہر: نجمہ

جاوید: (سوچتے ہوئے) نجمہ؟ کون نجمہ؟

اطہر: نجمہ کو بھول گئے وہ انکل غنی کی سٹینو تھی۔

جاید: (چونک کر) وہ؟ ۔۔۔۔ اچھا؟ (چپ ہو جاتا ہے)

اطہر: کیوں کیا خیال ہے تمہارا۔

جاوید: (نیم دلی سے بجھے ہوئے لہجے میں) اچھا ہے (پھر سوچ میں پڑ جاتا ہے)

اطہر: تم اس سے ملو گے تو خوش ہو گے۔ ہمارے اجڑے گھر کو اس نے آکر سنبھال لیا۔ والد کی حالت اب یہ ہے کہ بالکل سنک گئے ہیں۔ وہی ہے جو انھیں سنبھالتی ہے۔ فوٹو گرافی کے کام میں بھی شد بدھ رکھتی ہے سو میرا ہاتھ بھی بٹاتی ہے۔ سٹوڈیو اسی

نے سنبھال رکھا ہے۔

جاوید: (اداسی میں) اچھا تو میرے پیچھے بڑے بڑے انقلاب آ گئے۔

اطہر: یار تیرے ڈیڈی کمال کے آدمی نکلے۔ میں نے تو اب انھیں جانا ہے ورنہ میں بھی تیری طرح یہی سمجھتا تھا کہ۔۔۔۔(فقرہ نامکمل چھوڑ کر) گڈ سول (good soul)۔

جاوید: (اداسی سے) اچھا تو نے (سوچتا ہے) تو تیرا خیال ہے کہ۔۔۔۔(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

اطہر: کون؟ (اٹھ کر دروازے پہ جاتا ہے دروازہ کھولتا ہے تو ایک ساٹھا یا سٹھا قسم کا شخص جس کے بال کھچڑی ہیں داخل ہوتا ہے۔ اطہر تعجب اور خوشی سے) غنی انکل آ یئے۔

جاوید: (بیٹھے بیٹھے آنے والے شخص کو دیکھتا ہے چہرے پے ناگواری کا تاثر)

سیٹھ غنی: (جاوید کے قریب آتے ہوئے) بیٹے تم یہاں بیٹھے ہو۔ ادھر مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی ہے جو آتا ہے تمھیں پوچھتا ہے۔

جاوید: آپ کے دوست ہیں مجھے کس خوشی میں پوچھ رہے ہیں۔

سیٹھ غنی: بیٹا وہ تمھاری آمد کی خوشی میں تو دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تو آنے والے مبارک باد دیتے ہیں۔ اور تمھیں پوچھتے ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ چلو اٹھو۔

جاوید: چلوں گا۔ پہلے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

سیٹھ غنی: (جاوید کو غور سے دیکھتے ہوئے گھبرا کر) کیا؟

جاوید: یہی کچھ میجر مراد انکل کے بارے میں پوچھنا تھا (اطہر کی طرف دیکھتا ہے)

اطہر: (سٹپٹا کر) انکل آپ تو ابھی بیٹھے ہیں۔ میں ذرا اپنے پرندوں کو جا کر دیکھ لوں (احاطہ کی طرف نکل جاتا ہے)

سیٹھ غنی: (سٹپٹا کر) ہاں ہاں۔ ضرور پوچھنا۔ مگر اس وقت گھر میں مہمان اکٹھے ہیں کل اطمینان سے بیٹھیں گے تو بات کریں گے۔ میں تمھیں سارا قصہ بتاؤں گا۔

جاوید: نہیں کل نہیں ۔آج ۔اسی وقت ۔اسی گھڑی میں جاننا چاہتا ہوں ۔آپ کا پروجیکٹ تھا۔اس میں تو آپ دونوں ہی پارٹنر تھے۔ یہ کیسے ہوا کہ ایک پارٹنر بالکل تباہ ہو گیا۔

سیٹھ: بیٹے بزنس میں تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔آدمی یا لاکھوں میں کھیلتا ہے یا کوڑی کوڑی کا محتاج۔

جاوید: وہ بزنس تھا یا فراڈ تھا۔جو کچھ بھی تھا۔مگر یہ کیا بات ہے کہ ایک کے وارے نیارے ہو گئے اور دوسرا کنگال ہو گیا۔

سیٹھ: بیٹے تم بزنس سنبھالو گے اور آخر تمھیں اب سنبھالنا ہی ہے۔تو پھر تمھیں پتہ چلے گا کہ اس کاروبار میں نشیب وفراز ہیں بہر حال میں نے حتی الامکان مراد علی کی مدد کی ہے۔ میں نے اپنے دفتر سے کہہ دیا ہے کہ جوان سے کام لیا جا سکتا ہے۔کام لو۔اور ادائیگی کے سلسلہ میں ادھر سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔اور اطہر کو بھی۔۔۔۔

جاوید: (طنزیہ) جی ہاں وہ بتا رہا تھا کہ ڈیڈی نے میری بہت مدد کی ہے۔

سیٹھ: بس میں نے تھوڑا سا سہارا دیا تھا۔ ماشااللہ ہونہار ہے۔اس کا سٹوڈیو خوب چل رہا ہے۔بہر حال جو میں مدد کر سکتا تھا۔۔۔۔

جاوید: (طنزیہ) جی ہاں آپ نے اس کی بہت مدد کی ہے۔شادی بھی تو کرادی ہے۔

سیٹھ: (سٹپٹا کر) ہاں اس نے شادی بھی کر لی ہے۔ ماشااللہ ایک بیٹی کا باپ ہے۔

جاوید: (معنی خیز لہجے میں) یہ وہی لڑکی ہے نا جو آپ کی سٹینو ہو کرتی تھی۔

سیٹھ: (سٹپٹا کر) ہاں ہاں وہی نجمہ۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ میں نے کہا کہ پھر بسم اللہ کرو۔شرع میں کیا شرم ہے۔

جاوید: تعجب ہے۔

سیٹھ: کس بات پر۔

جاوید: اس گھر سے نجمہ کی رخصتی پر۔

سیٹھ: بیٹے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ نجمہ اور اطہر شادی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے شادی کر لی۔ تعجب کی اس کیا بات ہے۔

جاوید: (افسوس کے لہجہ میں) تعجب مجھے اس وجہ سے ہے کہ میری بدنصیب ماں نے کتنا چاہا کہ نجمہ کسی طور اس گھر سے رخصت ہو جائے اور اس کی زندگی سکون سے گذرے۔ مگر جیتیجی ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی (ٹھنڈا سانس بھر کر) افسوس۔

سیٹھ: (غصے سے) تمھاری ماں مرگئی اور میں اسے کیا کہوں۔ بڑی شکی عورت تھی۔ میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ وہی شک جو اس کے شیطانی دماغ کے اندر پلتے رہتے تھے۔ تمہارے کانوں میں بھرتی رہتی تھی۔ جاوید میری بات غور سے سنو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ اس زہر کو جو تمھاری ماں نے تمہارے اندر بھرا تھا۔ اسے نکال ڈالو ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ میں تمھیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے جو اتنے اصرار سے بلایا ہے تو کچھ سوچ کر بلایا ہے۔

جاوید: کیا سوچ کر۔

سیٹھ: آخر میں تمہارا باپ ہوں، تمہارا برا تو نہیں سوچ سکتا۔ تمہارے بھلے میں ہی کچھ سوچا ہوگا۔

جاوید: مگر مجھے پتہ تو چلنا چاہیے کہ میرے بھلے میں کیا سوچا گیا ہے۔

سیٹھ: بیٹے یہ جو اتنا کاروبار ہے اسے میں سینے پر رکھ کر قبر میں تو نہیں لے جاؤں گا۔ آخر کار تمھیں ہی سنبھالنا ہے۔ یہ لغویات چھوڑو۔ ہوش کی دوا لو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فرم میں آ کر ملازمت کرو نہیں پارٹنر بن کر اس میں شامل ہو جاؤ۔

جاوید: (طنزیہ مسکرا کر) میں اور آپ کا پارٹنر (ہنستا ہے)

سیٹھ: اس میں (ہنسنے) بری (کی) کیا بات ہے۔

جاوید: ڈیڈی آپ کی کوئی بات خالی از علت نہیں ہوتی۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر اچانک

مجھ پر یہ عنایت کیوں۔

سیٹھ: پھر وہی حماقت کی بات۔اس میں عنایت کی کیا بات ہے۔میں تمہارا باپ ہوں (لہجہ بدل کر) بیٹے میں بہت تھک گیا ہوں۔تھوڑا آرام چاہتا ہوں۔اور پھر یہ گھر کب تک اجڑا رہے گا۔تم آ کر رہو تو احساس تو ہو کہ گھر میں کوئی رہتا ہے۔

جاوید: کون کہتا ہے کہ یہ اجڑا ہوا گھر ہے۔مجھے تو یہاں کوئی بدانتظامی، بدسلیقی نظر نہیں آئی۔احساس ہی نہیں ہوتا کہ گھر میں کوئی گھر والی نہیں ہے۔شاید اس کا کریڈٹ زرینہ شیخ کو جاتا ہے۔

سیٹھ: ہاں اس خاتون نے مجھے بہت سہارا دیا ہے۔بہت دردمند خاتون ہے اور بہت سلجھی ہوئی۔

جاوید: جی ہاں اور بہت عقلمند۔کس سمجھداری سے نجمہ کو اس گھر سے چلتا کیا ہے۔

سیٹھ: سچ پوچھو تو دفتر اور گھر دونوں کو اسی نے سنبھال رکھا ہے۔مگر دنیا کو کسی کل چین نہیں۔اس سے وہ بھی پریشان ہے اور میں بھی۔مجھے اپنے سے زیادہ اس کی بدنامی کا خیال ہے۔

جاوید: (معنی خیز انداز میں) پھر کیا سوچا ہے؟

سیٹھ: کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔دوست کہتے ہیں کہ بدنامی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور سمجھاتے ہیں کہ اس طرح اکیلے کب تک دن گزارو گے۔

جاوید: آپ نے کیا جواب دیا۔

سیٹھ: میں تو یہی کہا کہ بیٹا میرا جوان ہے۔اس کی مرضی کے بغیر میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔

جاوید: (مسکرا کر طنزیہ لہجے میں) تو اسی لیے آپ نے مجھے بلایا ہے۔

سیٹھ: تمھیں بلانا تو مجھے تھا ہی۔بہر حال اب تم موجود ہو تو جو تمھاری مرضی ہوگی میں وہ

کروں گا اگر تم اس کے مخالف ہو تو پھر میں ۔۔۔۔۔

جاوید: (بات کاٹتے ہوئے) میں کیوں مخالفت کرنے لگا۔

سیٹھ: (اطمینان کا سانس) چلو میرے دماغ پر جو ایک بوجھ تھا وہ ہٹ گیا۔

جاوید: مگر میرے دل و دماغ پر جو ایک بوجھ چلا آ رہا تھا اس میں اضافہ ہو گیا۔

[ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اطہر لپک کر داخل ہوتا ہے فون سنتا ہے سننے، بات کرنے کے بعد واپس جانے لگتا ہے]

جاوید: اطہر سنا تم نے؟

اطہر: (ٹھٹھک کر) کیا؟

جاوید: ڈیڈی نے میری آمد کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کیا ہے آج سیٹھ ساہوکاروں سیٹھ غنی محمد کے نورِ نظر کی ملاقات کرائی جائے گی تم تو مدعو نہیں ہونا؟

سیٹھ غنی: (سٹپٹا کر) ارے ہاں بیٹا اطہر تم سے ہمارا contact ہی نہیں ہو تو تمھیں بھی اس دعوت میں شریک ہونا ہے۔

اطہر: (معذرتی لہجے) انکل بات یہ ہے کہ ۔۔۔۔

سیٹھ غنی: بات وات کچھ نہیں تمہارے دوست ہی کے اعزاز میں دعوت ہے تم کیسے نہیں چلو گے (جاوید سے) جاوید بیٹے تم بھی تو کہو۔

جاوید: ظاہر ہے اگر مجھے واقعی اس دعوت میں شریک ہونا ہے تو اطہر کو بھی ہونا پڑے گا ہاں اگر میں ۔۔۔۔۔

اطہر: (بات کاٹتے ہوئے) ہاں انکل کی بات کو تو میں رد نہیں کر سکتا ہے ظاہر ہے کہ چلوں گا۔

سیٹھ غنی: اطہر بیٹے اپنے دوست کو سمجھاؤ۔ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اس نے کچھ نہیں سیکھا۔

جاوید: (غصے سے) جی؟

اطہر: (بیچ میں آتے ہوئے) اچھا دیکھو مجھے ابھی تیار ہونا ہے تم انکل کے ساتھ چلے جاؤ میں تیار ہو کر ابھی آتا ہوں اتنی دیر میں نجمہ بھی آ جائے گی۔

جاوید: (طنزیہ) تو گویا تم نے دعوت میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اطہر: ہاں بالکل۔

سیٹھ غنی: (اٹھتے ہوئے) جلدی کرو۔ ادھر مہمان پوچھ رہے ہوں گے کہ دونوں باپ بیٹا کہاں غائب ہو گئے۔

جاوید: (بے دلی سے اٹھتے ہوئے) اچھا۔

[دونوں نکل جاتے ہیں ان کو اطہر آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر تیار ہوتا نظر آتا ہے]

[ٹائی باندھتا باندھتا دروازت پر جا کر کھولتا ہے ایک سمارٹ قسم کی خاتون داخل ہوتی ہے یہ زرینہ شیخ ہے]

اطہر: ارے آپ! آیئے آیئے۔

زرینہ: (ادھر اُدھر دیکھ کر) ارے یہاں تو کوئی نہیں ہے خیال تھا کہ جاوید تمھاری طرف ہے۔ غنی صاحب کہہ کر آئے تھے میں ابھی اسے لے کر آیا کتنی دیر گئی۔ ادھر مہمان آنے لگے ہیں۔

اطہر: بس ابھی نکلے ہیں پہنچنے والے ہوں گے۔

زرینہ: جاوید بہت پریشان کیا ہے ابھی تو آیا ہے آتے ہی اس نے اپنے لچھن دکھانے شروع کر دیے۔ ارے اطہر صاحب وہ تمہارا دوست ہے اسے سمجھاؤ۔ زندگی اس طرح تو نہیں گذرتی آخر وہ اب بچہ نہیں ہے۔ باپ سے بغاوت کر کے اسے اب تک کیا ملا۔ ٹھوکریں ہی کھانی پڑیں نا۔

اطہر: جی آپ بالکل بجا کہتی ہیں مگر میرا نہیں خیال کہ وہ پہلے کی طرح ناسمجھ رہا ہے۔ آخر اس نے اتنے سال باہر رہ کر دیکھ لیا ہے۔ زمانے کا گرم و سرد دیکھ لیا ہے اسے اب سمجھ آ گئی

ہے۔

زرینہ: (بیزاری سے) خاک سمجھ آ گئی ہے غنی صاحب نے اسے کس محبت سے بلایا ہے کتنے ان کے ارمان ہیں مگر وہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھا ہی جا رہا ہے آخر کوئی حد ہوتی ہے۔

اطہر: میں اس بات کروں گا۔

زرینہ: ارے تم کیا کرو گے میں اسے ٹھیک کروں گی (لہجہ بدل کر) اچھا خیر نجمہ کہاں ہے۔

اطہر: ذرا مارکیٹ گئی ہے خریداری کرنی تھی۔ آتی ہوں گی۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔

زرینہ: ارے بیٹھنے کا وقت کہاں ہے ادھر مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ کہنا کہ میں آئی اور منی تو اچھی ہے نا اس کی طرف سے بہت فکر ہے (رک کر) اچھا اس کے لیے کچھ کریں گے۔ تو میں چلتی ہوں۔

اطہر: جی اچھا بس میں بھی آ رہا ہوں۔

زرینہ: (چونک کر) اچھا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ آخر تم جاوید کے دوست ہو میں نے غنی صاحب سے کہا تھا کہ اطہر کو ضرور بلانا ہے اچھا (exit)

دوسرا منظر

[رات کا وقت وہی کمرہ۔ نجمہ اطہر کی بیوی جو چونتیس پینتیس کے پیٹے میں ہے۔ منی ان کی بیٹی۔ تیرہ چودہ کے سن کی لڑکی۔]

نجمہ: (سویٹر بنتے ہوئے) منی! بس اب کتاب بند کرو۔ بہت پڑھ چکیں۔ (منی اس طرح کتاب پڑھنے میں غرق رہتی ہے) سنا نہیں۔ کیا کہہ رہی ہوں۔ (سویٹر بننے میں اس طرح مصروف رہتی ہے)

منی: (کتاب پڑھتے نگاہیں اٹھائے بغیر) بس تھوڑا اور کہانی ختم ہونے لگی ہے۔

نجمہ: بہت دیر سے پڑھ رہی ہو۔ اپنی آنکھوں پر کچھ تو رحم کرو۔ ڈاکٹر نے یاد ہے پڑھنے کے سلسلہ میں کیا تاکید کی تھی۔

منی: امی بس کہانی ختم ہو رہی ہے تھوڑے سے صفحے رہ گئے ہیں۔

نجمہ: بڑے جو کہتے ہیں۔ سن لیا کرو۔ تمھارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔ بس کتاب بند کرو۔ باقی کہانی پھر۔

[منی کتاب بند کر دیتی ہے۔ کتاب الگ رکھ کر آنکھیں موندتی ہے۔ پلکوں پر ہاتھ پھیرتی ہے۔]

نجمہ: ذرا میرے حساب کی کاپی تو نکالو۔ آج کا حساب تو لکھ لوں پھر بھول جاؤں گی۔

[منی پاس پڑی میز کی دراز سے ایک چھوٹی سی کاپی اور بال پوائنٹ نکال کر لاتی ہے۔ نجمہ لے کر ورق اُلٹتی ہے اور لکھنا شروع کرتی ہے۔]

نجمہ: (لکھتے لکھتے) صبح کیا آیا تھا۔ ڈبل روٹی، دودھ کا پیکٹ۔۔۔

منی: اور مکھن، بڑی ٹکیا۔

نجمہ: پرسوں بھی تو بڑی ٹکیا آئی تھی۔ دو دن میں ختم ہو گئی۔

منی: جی

نجمہ: ہم لوگ بہت مکھن کھانے لگے ہیں۔ (پھر لکھنے لگتی ہے) گوشت تو آج نہیں آیا تھا؟

منی: نہیں

نجمہ: سبزی بھی آج کوئی نہیں آئی۔

منی: نہیں

نجمہ: پھر بھی اتنا حساب بن گیا (بڑبڑاتی ہے) کھایا کیا۔ دال اور خرچ اتنا ہو گیا۔ یہ مہنگائی تو ہمیں کھا کے چھوڑے گی۔

منی: امی ہم نے یہاں دال کھائی۔ وہاں پاپا مزے مزے کی چیزیں کھا رہے ہوں گے۔

نجمہ: کہہ کر گئے تھے کہ بس ساڑھے نو دس بجے تک آ جاؤں گا۔ ابھی تک تو نہیں آئے۔

منی: امی کیوں نہیں آئے پاپا ابھی تک؟

نجمہ: دعوتوں میں یہی ہوتا ہے اور یہ تو ویسے بھی بڑی دعوت ہے۔

[مراد علی بغل میں کاغذوں کا پلندہ دبائے چھڑی ٹیکتے داخل ہوتے ہیں]

منی: (خوش ہو کر) دادا ابا آ گئے۔

نجمہ: ابا جان! آج آپ کہاں پر گئے تھے کہ اتنی دیر سے آئے ہیں۔

مراد علی: بہو کیا پوچھتی ہو۔ آخری عمر میں ٹھوکریں کھانا تقدیر میں لکھا تھا۔ سو وہ کھا رہے ہیں۔ نقل نویسی سے چار پیسے مل جاتے ہیں۔ غنیمت ہے۔ مگر اس کے لیے خوار ہونا پڑتا ہے۔ اب تمھیں کیا بتائیں۔

نجمہ: کچھ اور کام ملا؟

مراد علی: ہاں ملا (پلندہ دکھاتے ہوئے) یہ دیکھو۔ اب اس پر جت جاؤں گا۔ (لہجہ بدل کر) اچھا اس نے بعد میں تمھیں پریشان تو نہیں کیا۔

[اور فوراً عقبی دروازے پر جا کر آہستہ سے ایک کواڑ کھول کر جھانکتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد کواڑ اسی آہستگی سے بند کر کے]

سب بسیرے میں ہیں۔ وہ بھی۔ دیکھو وہ خود ہی آخر اپنے خانے میں چلی گئی۔ کس آرام سے بسیرا لے رہی ہے۔

منی: دادا ابا! اتنا جاڑا ہے آج۔ اسے ٹھنڈ تو نہیں لگ جائے گی۔ بیچاری کہیں ٹھٹھر کے نہ رہ جائے۔

مراد علی: نہیں بیٹی۔ میں نے خانے میں پھونس بچھا کر خوب گرم کر دیا ہے (چلتے ہوئے) اچھا تم لوگ آرام کرو۔

نجمہ: ابا جان کھانا نہیں کھائیں گے آپ۔

مرادعلی: نہیں بہو۔ چائے میں نے آج بہت پی لی ہے۔اس کے ساتھ اچھا خاصا ٹونگ لیا ہے۔تم نے کھالیا ہے نا۔

نجمہ: ہاں ہم نے تو کھالیا۔آپ کا انتظار کیا۔اطہر کو تو گھر پہ آج کھانا کھانا بھی نہیں تھا۔ویسے میں نے آپ کے لیے کھانا رکھ دیا ہے۔

مرادعلی: ہاں ٹھیک ہے۔تمھیں فکر کی ضرورت نہیں ہے۔بھوک لگی تو خود ہی جا کر نوالہ دو نوالہ کھا لوں گا۔

منی: دادا ابا! پاپا ابھی تک آئے نہیں۔

مرادعلی: بیٹی ذرا دیر سے آئیں گے۔آخر دعوت پہ گئے ہیں۔بڑی دعوت ہے۔بیٹا جو آیا ہے۔ پندرہ برس بعد اور گھر لوٹا ہے۔

نجمہ: کیسے آ گیا۔

مرادعلی: پیسے میں بڑی طاقت ہے۔باپ نے سبز باغ دکھایا ہوگا۔کھینچا چلا آیا (چلتے ہوئے) خیر اچھا ہوا۔بہت اچھا ہوا۔

[بائیں والے دروازے کو جو اس کے کمرے میں نکلتا ہے کھول کر داخل ہو جاتا ہے]

نجمہ: (حساب کی کاپی بند کر کے پھر سویٹر بننا شروع کر دیتی ہے۔بڑبڑاتی ہے)
بیچارے ابا جان صحیح کہتے ہیں۔اس بڑھاپے میں انھیں کیا پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔

منی: امی! دادا ابا اتنی محنت کیوں کرتے ہیں۔

نجمہ: (ٹھنڈا سانس) ہمارے حالات اچھے ہوتے تو ہم انھیں کیوں اتنا سر کھپانے دیتے۔ مگر کیا کریں۔

[دروازہ کھلتا ہے۔اطہر سوٹ بوٹ میں ملبوس اوور کوٹ پہنے، ہیٹ لگائے داخل ہوتا ہے۔]

منی: (خوش ہو کر) پاپا آ گئے۔پاپا آ گئے۔

[دوڑ کر لپٹ جاتی ہے۔ اطہر پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہے ۔ ہیٹ اور اوورکوٹ اتارنے لگتا ہے۔منی اوورکوٹ لے کرکوٹ کی سلوٹیں درست کرتی ہے]

منی: پاپا دعوت میں کیا کیا تھا۔

اطہر: بہت مزے مزے کی چیزیں۔

نجمہ: دعوت اتنی جلدی ختم ہوگئی۔

اطہر: لوابھی ختم ہوجائے گی۔محفل تو اب جمے گی۔کھانے کے بعد۔مگر میں بس کھانا کھاتے ہی چلا آیا۔کہتے بھی رہے لوگ کہ تم سے ابھی غزلیں سننی ہیں۔

نجمہ: لوگ اصرار کر رہے تھے تو رک جاتے۔کلام سنا کرآتے۔

اطہر: کسے سنا کرآتا۔ایک سے ایک کورا ورق بیٹھا تھا۔پیسے سے ذوق تو نہیں خریدا جا سکتا۔ شعر کا انھیں کیا پتہ۔انھیں تو بوریت ہو رہی تھی۔جاوید نے اچھا کیا کہ مجھے ان کے بیچ سے اٹھا کر الگ لے گیا۔

نجمہ: جاوید ٹھیک ہے۔کیا رنگ ڈھنگ ہیں اب اس کے۔

اطہر: مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آیا۔

نجمہ: فرق یہ تھوڑا ہے کہ واپس آگیا۔پہلے تو باپ کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

اطہر: ہاں۔یہ تو ہے۔پتہ نہیں انکل غنی سے اسے کیسے رام کرلیا۔

نجمہ: بقول ابا جان۔پیسے میں بڑی طاقت ہے۔

منی: پاپا، آپ نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔

اطہر: وعدہ؟ کیا وعدہ کیا تھا (یاد کرتے وئے) ہاں۔ارے میں تو بالکل بھول گیا۔

منی: نہیں، آپ لائے ہیں۔مجھ سے چھپا رہے ہیں۔

اطہر: نہیں بیٹی، واقعی بھول گیا۔مگر کوئی بات نہیں کل پرسوں میں نکلوں گا تو تمھاری چیز لے آؤں گا۔

نجمہ: پرسوں تمھیں کہاں فرصت ملے گی۔ پرسوں تو منی کی سالگرہ ہے۔ بھول گئے۔

[بائیں والا دروازہ کھلتا ہے۔ مراد علی برآمد ہوتے ہیں]

مراد علی: اطہر میاں تم آ گئے؟

اطہر: جی ابا جان۔ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں۔

مراد علی: میں بھی آج دیر سے آیا۔

اطہر: اور آپ کے مہمان کا کیا حال ہے۔

مراد علی: (خوش ہو کر) ہاں۔ ہاں۔ اب ٹھیک ہے۔ اپنے نئے گھر میں مانوس ہو گئی ہے۔

اطہر: اچھا؟

مراد علی: ہاں ابھی میں نے جھانک کر دیکھا۔ اپنے خانے میں ہے۔ مزے سے بسیرے میں ہے۔ میں کہا تھا نا کہ نئی جگہ ہے۔۔۔[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں] رفتہ رفتہ مانوس ہو جائے گی۔ مگر ابھی تھوڑا اور بندوبست کرنا پڑے گا۔

اطہر: کیا؟

مراد علی: بیٹھ کر سوچیں گے۔

اطہر: تو ابھی بیٹھ کر سوچ لیتے ہیں۔

مراد علی: (پائپ کو دیکھتے ہوئے) بھئی اب ہم اپنا پائپ بھر لیں۔ (واپس کمرے میں چلے جاتے ہیں)

منی: (قریب آ کر) پاپا۔ آج ہم نے آئس کریم کھائی تھی۔

اطہر: اچھا؟

منی: آپ کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ لاؤں؟

اطہر: نہیں بیٹی۔ اس وقت نہیں۔ اس وقت تو میں ویسے ہی تم سے شرمندہ ہوں۔ دعوت اڑاتا رہا اور یہ بھول ہی گیا کہ تم سے کیا وعدہ کیا تھا۔ خالی ہاتھ گھر چلا آیا۔

نجمہ: پھر کیا ہوا۔ کون سا گاڑی نکلی جارہی ہے۔ پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔

اطہر: نہیں، میں منی کا ملزم ہوں۔ منی مجھے معاف کردو۔

نجمہ: لوتم منی کے ملزم بن گئے۔ یہ کیسی باتیں کرتے ہوتم۔

اطہر: نہیں میں نے منی کا دل توڑا ہے۔ منی تم مجھے معاف نہیں کروگی۔

منی: (اطہر کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے) پاپا۔ میرے پاپا بہت اچھے ہیں۔

اطہر: اصل میں سوطرح کی فکریں سر پہ سوار ہوتی ہیں۔ سوطرح کی الجھنیں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو بات یاد کر کے گھر سے نکلتا ہوں۔ جاکر ذہن سے بالکل نکل جاتی ہے۔ آج بھی یہی ہوا۔

(دروازے کی گھنٹی بجتی ہے)

(چونک کر) یہ بے وقت کون آ گیا (اٹھنے لگتا ہے)

نجمہ: تم بیٹھو۔ میں جاکر دیکھتی ہوں۔

اطہر: نہیں میں دیکھتا ہوں۔

[باہر نکل جاتا ہے۔ نجمہ خاموشی سے سویٹر بنتی رہتی ہے۔ تھوڑی دیر میں اطہر جاوید کے ساتھ داخل ہوتا ہے]

اطہر: نجمہ! پہچانو اس شخص کو۔

نجمہ: (دیکھ کر کسی قدر چونکتی ہے۔ پھر فوراً نارمل ہو جاتی ہے ہلکی سی مسکراہٹ) انہیں پہچانا کون سا مشکل کام ہے سنی سنائی باپ کی شکل ہے۔

جاوید: ہرگز نہیں میں ماں پر گیاں۔ باپ نہیں۔ وہ آپ کو یاد ہوں گی نا۔

نجمہ: (اسی سکون سے) اچھی طرح۔

اطہر: یار گھر پہ بڑی پارٹی ہو رہی ہے تو پارٹی چھوڑ کر آ گیا۔

جاوید: پارٹی بھی اور گھر بھی (رک کر) میں نے گھر چھوڑ دیا ہے۔

اطہر: (چکرا کر) گھر چھوڑ دیا ہے؟ کیا بکواس کر رہا ہے یار۔

جاوید: ٹھیک کہہ رہا ہوں۔

اطہر: یار گھر۔۔۔۔دم تو لیا ہوتا۔ ابھی تو بستر بھی نہیں کھلا تھا۔ کھلنے سے پہلے ہی لپیٹ دیا۔ بات کیا ہوئی۔

جاوید: کوئی نئی بات نہیں۔ میرا باپ اسی پرانی روش پر قائم ہے۔

اطہر: اچھا خیر، تم اطمینان سے بیٹھو۔ اوورکوٹ اتار دو۔ چائے پیتے ہیں۔ اور پھر سوچتے ہیں۔ نجمہ چائے ملے گی۔

نجمہ: کیوں نہیں (منی سے) منی جاؤ، چائے کے لیے پانی رکھو۔

[منی چلی جاتی ہے جاوید کوٹ مفلر اتار کر صوفے پر اطمینان سے بیٹھتا ہے۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر جائزہ لیتا ہے]

جاوید: اچھا تو یہ ہے تمہارا گھونسلا۔

نجمہ: بس گھونسلا ہی ہے۔ جس میں ہم پھنسے ہیں۔ یہ اس گھر کا سب سے بڑا کمرہ ہے۔ یہی ہمارا اسٹوڈیو ہے یہیں ہم اٹھتے بیٹھتے ہیں بلکہ اکثر کھانا پینا بھی یہیں کر لیتے ہیں۔

اطہر: اس سے پہلے ہم نے جو مکان لیا تھا وہ اس سے بہتر تھا مگر اس مکان کا ایک فائدہ ہمیں یہ ہے کہ اس میں کچھ کمرے باہر کی طرف بھی ہیں۔

نجمہ: ایک کمرہ خالی پڑا ہے۔ جسے شاید ہم کرائے پر اٹھا دیں۔

جاوید: اچھا، یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔

[منی داخل ہوتی ہے۔ نجمہ کے کان میں کچھ کہتی ہے)

نجمہ: نہیں، بس تم چائے بناؤ۔

(چلی جاتی ہے۔ جاوید اسے غور سے دیکھتا ہے)

جاوید: یہ تمھاری بیٹی تھی۔

اطہر: ہاں بس یہی ایک بیٹی ہے ہماری۔

جاوید: کوئی بیٹا؟

اطہر: کوئی نہیں۔بس ایک بیٹی ہے (اداس ہو کر) اور وہ بھی (کہتے کہتے رک جاتا ہے)

جاوید: کیوں کیا بات ہے۔

اطہر: ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کی بینائی چلی جائے گی۔

جاوید: اچھا (رک کر) کسی سپشلسٹ کو دکھایا؟

اطہر: سب کو دکھالیا۔

جاوید: ۔۔۔بیچاری۔ڈاکٹر کچھ بتاتے ہیں کہ سبب اس کا کیا ہے۔

اطہر: ان کا کہنا ہے کہ یہ وارثت کا چکر ہے۔

جاوید: (تعجب سے) وراثت (سوچ میں پڑ جاتا ہے)

اطہر: ابا جان بتاتے ہیں کہ ان کی والدہ کی بینائی چلی گئی تھی۔یعنی ہماری نانی کی۔ مجھے بھی تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔ٹٹول کر چلا کرتی تھیں۔

جاوید: یہ تو قدرت نے غریب کے ساتھ بہت ستم کیا ہے اور اس عمر میں اس پر تو اس کا بہت اثر ہوگا۔

اطہر: ہم نے ابھی اسے بتایا نہیں ہے۔

[منی داخل ہوتی ہے سیدھی اطہر کے پاس جاتی ہے اور کان میں کچھ بات کرتی ہے]

اطہر: (ہنستا ہے) بیٹی خود پوچھ لو ان سے ۔ یہ تمہارے چچا ہیں ۔ جاوید انکل ۔ پوچھ رہی ہے۔آئس کریم لاؤں (منی سے) ان کے پاس جاؤ اور پوچھو۔

[منی جاوید کے پاس جاتی ہے جاوید اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا ہے]

منی: انکل، آپ آئس کریم کھائیں گے۔

جاوید: نہیں بیٹی، آئس کریم پھر۔ اس وقت صرف چائے پئیں گے۔ (چلی جاتی ہے)

ماشااللہ بہت پیاری بچی ہے اور ویسے بالکل ٹھیک ٹھاک۔

نجمہ: ہاں شکر ہے۔ باقی اور کوئی دکھ بیماری نہیں ہے۔

جاوید: عمر کیا ہوئی؟

نجمہ: ماشااللہ چودھواں برس جا رہا ہے۔کل اس کی سالگرہ ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ اب پندرھواں لگے گا۔

جاوید: ویسے قد نکلتا ہوا ہے۔آج کل تو لڑکیوں کا قد ہی نہیں ہوتا۔

نجمہ: ماشااللہ اسی ایک سال کے اندر اندر اس کا قد نکلا ہے۔

جاوید: یار کب ہوئی تھی تیری شادی؟

نجمہ: پندرھواں برس ہونے کو آرہے ہیں۔

جاوید: ارے اتنا عرصہ ہو گیا ہے تم لوگوں کی شادی کو۔

اطہر: اپنے متعلق سوچ کتنا عرصہ ہو گیا گئے ہوئے۔ ویسے کل کی ہی بات لگتی ہے۔ ویسے تجھے کیا محسوس ہوتا ہے کہ بہت وقت گذر گیا۔

جاوید: وقت آگے تو کاٹے نہیں کٹتا تھا مگر اب یوں لگتا ہے کہ وقت بہت تیزی سے گذر گیا۔

[مراد علی داخل ہوتے ہیں۔ پائپ کے بغیر سر پر فوجی یونیفارم والی ٹوپی منڈھی ہوئی ہے۔]

مراد علی: پائپ کا تمبا کو بھی ختم ہو گیا کوئی بات نہیں۔ پھر آؤ اس کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

اطہر: (قریب جا کر اونچی آواز سے جیسے وہ کم سنتے ہوں) ابا جان اس وقت مہمان آئے ہوئے ہیں۔ یہ ہیں جاوید۔جاوید غنی۔انکل غنی کے بیٹے۔آپ کو یاد ہوگا۔

مراد علی: (تھوڑی سی گھبراہٹ کے ساتھ) غنی کا بیٹا، کیا کہتا ہے۔اب ہمارے پاس ہے کیا۔

اطہر: نہیں ابا جان، آپ سے کوئی مطالبہ کرنے تھوڑا ہی آیا ہے۔ میرا دوست ہے۔ مجھ سے

ملنے آیا ہے۔اب وہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے۔

مرادعلی: اچھا اچھا تو میرا کوئی قصہ نہیں ہے۔

اطہر: نہیں

جاوید: (قریب جا کر سلام کرتا ہے) انکل میں آپ کے لیے پیغام لے کر آیا ہوں۔

مرادعلی: پیغام۔کیسا پیغام۔کس کی طرف سے۔

جاوید: آپ کی چھوڑی ہوئی شکار گاہوں کی طرف سے۔ہزارہ کی شکار گاہیں۔آپ کو یاد کرتی ہیں۔

مرادعلی: (ٹھنڈا سانس بھر کر) ہاں بیٹا، اپنا وہ بھی زمانہ تھا۔میں نے اس علاقہ کا ایک ایک چپہ دیکھا ہے۔سارے جنگل کھنگال ڈالے تھے۔بہت شکار کھیلا وہاں (رُک کر) میں نے وہاں شیر کا شکار بھی کیا ہے۔ایک مرتبہ ایک ریچھ میری زد میں آ گیا۔بہت شکار کھیلا ہے۔کیا حال ہے ان جنگلوں کا۔

جاوید: جنگل اب اتنے گھنے نہیں رہے۔آپ کو یاد ہوگا میں نے ایک مرتبہ آپ کے وہاں ہوتے ہوئے پھیرا لگایا تھا۔آپ کے ساتھ شکار پہ گیا تھا۔کیسا گھنا جنگل تھا جیسے رات ہوگئی ہو۔اب وہاں جنگل اتنا گھنا نہیں رہا۔

مرادعلی: یہ کیسے ہوا؟

جاوید: درخت بہت کٹ گئے۔جنگل اب چھدرے نظر آتے ہیں۔

مرادعلی: درخت کٹ گئے (تشویش سے) یہ بہت غلط کام ہوا۔خطرناک جنگل اپنا انتقام لیتے ہیں۔

جاوید: ہاں یہ اچھا نہیں ہوا (رُک کر) انکل آپ کیسے گذارہ کرتے ہیں۔اس فضا میں آپ کا دم نہیں اُلٹتا۔بور نہیں ہوتے آپ۔

مرادعلی: (تعجب سے) کیوں کیسی فضا ہے؟

جاوید: میرا مطلب ہے کہ آپ نے آزادانہ ماحول میں زندگی گذاری ہے۔ جنگل کھلی فضا، ٹھنڈی تازہ ہوا، اور شکار، ہرن، نیل گائے، بارہ سنگھا، تیتر، قاز، مرغابی۔۔۔۔۔

مرادعلی: (مسکراکر) اطہر۔ ذرا انھیں دکھاؤ۔

اطہر: نہیں ابا جان اس وقت نہیں۔

جاوید: (مرادعلی سے) انکل میرے ساتھ کیوں نہیں چلے چلتے۔ میں یہاں رکوں گا نہیں۔ بس جانے والا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ وہاں مزے سے گھومتے، پھرتے شکار کھیلیے۔ یہاں آپ کی دلچسپی کا کیا سامان ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ یہاں آخر آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ کے کرنے کے لیے ہے کیا یہاں۔

مرادعلی: (تعجب سے) میرے کرنے کے لیے یہاں کچھ نہیں۔ میری دلچسپی کا سامان؟

جاوید: مانتا ہوں کہ یہاں آپ کا بیٹا ہے۔ مگر اس کی اپنی فیملی ہے۔ اپنی دلچسپیاں ہیں۔ آپ جس زندگی کے رسیا تھے، شکار، جنگل، جانور، پرندے، وہ تو یہاں ہے ہی نہیں۔

مرادعلی: (جوش میں آکر میز پر مکہ مارتے ہوئے) اطہر اٹھو، دکھاؤ انھیں ابھی۔ اسی وقت۔

اطہر: ابا جان۔ وہ اندھیرا ہے۔ کیا نظر آئے گا۔

مرادعلی: کیا فضول بکتے ہو۔ دیکھتے نہیں چاندنی نکلی ہوئی ہے۔ (اٹھتے ہوئے) جاوید کو دکھاؤ (جاوید) اٹھو میں تمھیں دکھاتا ہوں۔

(منی چائے لے کر داخل ہوتی ہے۔ چائے میز پر رکھتے ہوئے)

منی: انکل آپ پہلے دیکھ لیں۔ چائے اس کے بعد۔

جاوید: (اٹھتے ہوئے) کیا چیز ہے بھئی کچھ بتاؤ تو سہی۔

نجمہ: کوئی ایسا عجوبہ نہیں ہے۔ بہرحال اب ابا جان کی خواہش ہے تو آپ دیکھ لیں۔

اطہر: (بے دلی سے) چلو یار دیکھ ہی لو۔

[تینوں اٹھ کر عقبی دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ منی مرادعلی کو سہارا دیتی ہوئی چلتی

ہے۔ نجمہ اپنی جگہ بیٹھی ہوئی سویٹر بنتی رہتی ہے۔ مراد علی ایک کواڑ تھوڑا سا کھول کر جاوید کو اشارہ کرتے ہوئے]

مراد علی: آؤ دیکھو۔

جاوید: (جھانک کر دیکھتا ہے) کیا ہے بھئی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا (وقفہ) اچھا آپ نے مرغیاں پال رکھی ہیں۔

مراد علی: صرف مرغیاں

جاوید: کبوتر بھی ہیں۔

مراد علی: کبوتروں کی کا بک تو اصل میں اوپر کوٹھے پر ہے۔ بڑی بڑی اعلیٰ نسل کا کبوتر میں نے جمع کیا ہے۔ لقا، شیرازی، جوگیا، لوٹن، کامبرے، میپررے، کل پوٹیے۔

منی: انکل وہ جو ٹاپا رکھا ہے نا، تھوڑا سا اٹھا ہوا، وہاں دیکھتے کیا ہے۔

جاوید: (جھانک کر پھر دیکھتا ہے) خرگوش، آپ نے خرگوش بھی پال رکھے ہیں۔

مراد علی: ہاں ہاں خرگوش بھی پال رکھے ہیں۔ مگر تم ٹاپے کے نیچے دیکھو کیا ہے۔

جاوید: کوئی پرندہ نظر آ رہا ہے (وقفہ) یہ مرغابی تو نہیں ہے؟

مراد علی: (خوش ہو کر) بالکل ٹھیک۔ مرغابی ہی ہے۔ مگر کون سی مرغابی۔ یہ کوئی عام مرغابی نہیں ہے۔

جاوید: ہاں لگتا ہے کوئی خاص نسل ہے۔

مراد علی: بہت اعلیٰ مرغابی ہے۔ ایک دم سے جنگلی۔

منی: انکل یہ میری مرغابی ہے۔

جاوید: واہ بھئی واہ۔ تم نے تو کمال کی چیز پال رکھی ہے۔ لیکن جنگلی پرندہ ہے۔ اس فضا میں کیسے رہے گا۔

مراد علی: کیوں۔ فضا اسے کیا کہتی ہے۔ چھوٹا سا ٹب ہم نے اس کے لیے لا کر رکھ دیا ہے۔

مزے سے اس میں تیرے۔ ڈبکیاں لگائے۔

نجمہ: ارے بھئی ان کے بسیرے میں خلل مت ڈالو۔ ویسے بھی بہت ٹھنڈ ہے۔ آپ لوگوں نے دروازہ کھول رکھا ہے۔ ٹھنڈ کسی کو لگ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

[مراد علی دروازہ بند کرتے ہیں۔ آ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں۔ نجمہ چائے بنا کر سب کو پیش کرتی ہے۔]

مراد علی: مرغابی کمال کا پرندہ ہوتا ہے۔

جاوید: مرغابی کو شکار تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر اسے زندہ پکڑنا، یہ تو کم کم ہی ہوتا ہے۔ کیسے پکڑ لیا آپ نے اسے۔

مراد علی: میں نے اسے کہاں پکڑا ہے۔ اس شہر میں ایک شخص ہے جس کا مجھے اس سلسلہ میں شکر گذار ہونا چاہیے۔

جاوید: (چونک کر) وہ کون شخص ہے۔ کہیں میرا باپ تو نہیں ہے۔

اطہر: کمال ہے یار۔ تم نے کیسے بھانپ لیا۔

جاوید: یار تو نے میرے باپ کے اتنے احسانات ایک سانس میں گنا ڈالے۔ میں نے سوچا کہ پھر یہ احسان بھی اسی نے کیا ہوگا۔ شکار کا تو وہ بھی دھنی ہے۔

نجمہ: مگر یہ عطیہ کسی اور کا ہے۔

مراد علی: بہر حال اسے گرایا تھا غنی نے۔ چونکہ اب اس کی بینائی ٹھیک کام نہیں کرتی۔ اس لیے مرغابی کو گولی چھچھلتی سی لگی۔ بس تھوڑی گھائل ہوگئی۔ برکت اللہ تو اسے حلال کرنے لگا تھا۔ میں نے کہا کہ یار جب غنی کی گولی سے بچ گئی تو تُو کیوں اس کے گلے پہ چھری پھیرتا ہے۔ مجھے دے دے۔ اس نے مجھے دے دی۔ میں نے زخم پہ ہلدی چونا لگا کے اسے ٹھیک کر لیا۔

اطہر: اب تو خوب موٹی ہو رہی ہے۔ اب تو اس جگہ سے بھی مانوس ہو چلی ہے۔ اب شاید

اسے وہ جھیل وہ درختوں کے جھُنڈ یاد بھی نہ ہوں۔

جاوید: ہاں مگر یہ احتیاط کرنا کہ آسمان اسے دکھائی نہ دے۔ ورنہ اڑ جائے گی (اچانک پہلو بدل کر) اچھا اب مجھے چلنا چاہیے۔ میجر انکل کو شاید اب نیند آنے لگی ہے۔

(مراد علی کھڑے ہو جاتے ہیں)

مراد علی: ہاں بھئی تم لوگ باتیں کرو۔ بوڑھا آدمی ہوں۔ زیادہ نہیں جاگ سکتا (چلے جاتے ہیں)

اطہر: (جاوید کو اوور کوٹ دیتے ہوئے) کہاں جائے گا اس وقت۔

جاوید: کسی ہوٹل میں جا کر بسیرا کریں گے۔

اطہر: اس کے بعد؟

جاوید: وہیں کہیں ٹھکانا تلاش کریں گے (وقفہ) ہاں، یار ابھی تو کہہ رہا تھا کہ تیرے گھر میں ایک کمرہ کرائے کے لیے خالی ہے۔

اطہر: ہاں ہے تو سہی۔ کیوں کوئی کرایہ دار نظر میں ہے۔

جاوید: میں خود جو ہوں۔

اطہر: تو؟ اچھا؟

نجمہ: نہیں بھیا وہ تمھاری شان کے لائق نہیں ہے۔

جاوید: (ہنس کر) اچھا میں بہت شان والا ہوں (اطہر سے) یار تو وہ کمرہ مجھے کرائے پہ دے دے بس مجھے paying gust کے طور پر رکھ لے۔ اگر تو رضا مند ہو تو میں صبح ہی آ کر یہاں ٹھکانا کر لوں۔

اطہر: نیکی اور پوچھ پوچھ۔

نجمہ: (کچھ پریشان سی ہو جاتی ہے) میں نے کہا نا کہ وہ کمرہ تمھاری حیثیت کے لائق نہیں ہے۔ بہت خستہ حالت میں ہے۔

جاوید: بھابھی، اپنی حالت بھی خستہ ہی ہے۔

اطہر: میری دانست میں تو وہ ٹھیک ٹھاک جگہ ہے۔

نجمہ: اطہر یہ تو سوچو کہ برابر کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کے کیا طور طریقے ہیں۔ جاوید کے لیے دردِ سر بن جائیں گے۔

جاوید: وہ کون ہیں۔

اطہر: اپنے ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ویسے اچھے آدمی ہیں۔ بس ذرا۔۔۔۔

نجمہ: ڈاکٹر فاروقی۔۔۔ وہ بہت جھکی ہیں۔

جاوید: کوئی بات نہیں ہے۔

نجمہ: بھائی آپ سوچ لیں۔ آپ کو ایک پل چین نہیں لینے دیں گے۔ جینا دوبھر کر دیں گے۔ تو آپ سوچیں۔

جاوید: میں نے خیر سوچ لیا ہے۔ مگر شاید آپ کو میرا یہاں رہنا پسند نہیں آ رہا۔

نجمہ: نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ کرائے دار کی حیثیت سے نہیں آپ تو اپنے ہیں۔ بس آپ آ کر رہیں۔ میں تو آپ کی خاطر کہہ رہی تھی۔

جاوید: بس بھابھی نے کہہ دیا۔ کل میں اپنا بوریا بستر لے کر آ رہا ہوں اجی اطہر۔۔۔۔
[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں]۔۔۔۔ (آ جاؤں گا جب پھر باقی باتیں)۔
[تیزی سے نکل جاتا ہے۔ اطہر ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے]

اطہر: چلو اچھا ہوا۔ جاوید سے بہتر ہمیں کون کرایہ دار مل سکتا تھا۔

منی: انکل آ جائیں گے تو پھر کتنا اچھا ہوگا۔

نجمہ: اطہر کچھ سوچا کرو یوں ہی فیصلے مت کر لیا کرو۔ تمھیں پتہ ہے کہ جاوید باپ سے لڑ کر یہاں آ رہا ہے۔ غنی انکل سوچیں گے کہ تم نے اسے ورغلایا ہے۔

اطہر: ہمارا ضمیر صاف ہے۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو سوچنے دیں۔

نجمہ: یہ تو سوچو کہ تم پر ان کے احسانات۔۔۔۔۔

اطہر: (بات کاٹ کر غصہ سے) کیا تم ان کے احسانات گناتی رہتی ہو۔ ہمیں برباد کرنے والے بھی تو وہی ہیں۔

نجمہ: بہرحال میں نے تمھیں اونچ نیچ سمجھا دی ہے۔ باقی تم جانو۔

اطہر: وہ میں بھی سمجھتا ہوں۔ مگر میں ان کا زرخرید غلام نہیں ہوں۔ اور پھر جاوید میرا دوست ہے۔ میں اسے انکار کیسے کرسکتا ہوں۔ (دیوار پر لگی گھڑی میں ٹن ٹن بارہ بجتے ہیں)

نجمہ: (کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا بہت رات ہوگئی۔ اب سونا چاہیے۔ (پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

[اطہر کا وہی بڑا کمرہ جو اس کا سٹوڈیو بھی ہے۔ صبح کا وقت دریچے کا پردہ ہٹا ہوا ہے اور دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی ہے۔ اطہر اپنی تصویروں کی ری ٹچنگ میں مستغرق ہے۔ سامنے میز پر فوٹو گراف بکھرے پڑے ہیں۔ نجمہ سبزی ترکاری سے بھرا ایک تھیلا لیے اس دروازے کے جو برآمدے میں کھلتا ہے۔ داخل ہوتی ہے۔]

اطہر: (اسی طرح کام کرتے ہوئے) اچھا تم آ گئیں۔ خریداری ہوگئی۔

نجمہ: (تھیلا ایک طرف رکھتے ہوئے) ہاں۔ بازار میں تو صرف لوٹ مچی ہوئی ہے۔ اتنی مہنگائی۔ یا اللہ غریب کہاں جائیں گے۔ کیا کھائیں گے۔

اطہر: جاوید کے کمرے کو جا کر دیکھا۔

نجمہ: ہاں دیکھا حشر مچا ہوا ہے۔

اطہر: (نظریں اُٹھا کر نجمہ کو دیکھتا ہے) کیسے؟

نجمہ: تمھارے دوست کو آتا جاتا کچھ نہیں۔ بالکل اناڑی۔ مگر اپنے آپ کو بقراط سمجھتے ہیں۔ ہر کام خود کرنا چاہتے ہیں۔ کرتے کم ہیں بگاڑتے زیادہ ہیں۔ سٹوو کے ساتھ پتہ نہیں کیا کارستانی کی۔ دیا سلائی جو دکھائی تو بھک سے آگ بھڑک اُٹھی۔ موصوف نے

آگ بجھانے کی ترکیب یہ سوچی کہ پانی کا پورا جگ سٹوو پہ اُلٹ دیا۔ سارے کمرے میں گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ اور تیل کی بدبو ایسی کہ دماغ پھٹ جائے۔ میں تو فوراً نکل کے بھاگی۔

اطہر: حد ہوگئی تو اب صفائی کیسے ہوئی۔

نجمہ: صفائی تو خیر ہو جائے گی۔ میں نے مائی سے کہا ہے کہ جا کر جھاڑو دو اور ٹاکی لگاؤ مگر بُو جو بھری ہوئی ہے۔ میں ابھی تو ادھر نہیں جاؤں گی۔ شام تک جا کر کہیں کمرہ درست ہو گا۔

اطہر: اور وہ موصوف کہاں ہیں۔

نجمہ: یہ کہہ کر نکل گئے کہ تھوڑا سا کام ہے کر کے تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ تمھارا دوست مجھے تو لگتا ہے سنک گیا ہو۔

اطہر: اب سنک گیا ہے ۔چلو ہمیشہ کا سنکی ہے۔

نجمہ: تم نے اس سے دوپہر کے کھانے کے لیے کہہ دیا۔ مگر ایسے شخص کا کیا اعتبار۔ ہم انتظار میں سوکھتے رہیں اور وہ شہزادے اپنی لہر میں کہیں اور نکل جائیں۔

اطہر: نہیں ایسی بات بھی نہیں ہے۔ اس وقت تک آ جائے گا۔ یاد آیا۔ میں نے ڈاکٹر سے بھی کہہ دیا ہے کہ آج دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔

نجمہ: تو گویا پوری دعوت ہوگی۔

اطہر: ارے یہ کون سے باہر کے مہمان ہیں زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں ہے کہہ دیں گے کہ بھئی خانہ بے تکلف ہے۔ اسے دعوت شیراز سمجھو۔

نجمہ: فیر کچھ نہ کچھ کر لیں گے ویسے اچھا ہے جاوید سے ڈاکٹر کا تعارف ہونا چاہیے۔

اطہر: یہی میں نے سوچا تھا۔

[مراد علی کے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلتا ہے۔ مراد علی جھانک کر دیکھتے ہیں۔]

مرادعلی: اطہر میاں۔

نجمہ: ابا جان کسی چیز کی ضرورت ہے۔

مرادعلی: (نجمہ کو دیکھ کر) اچھا تم بھی ہو۔نہیں بہو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے (دروازہ بند کرتے ہیں)

اطہر: پروفیسر اور ڈاکٹر نے رات پھر گھر سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔

نجمہ: اچھا؟ میں تو آرام سے سوئی تھی کہیں صبح ہی جا کر میری آنکھ کھلی۔

اطہر: ہاں تم تو بے خبر پڑی خراٹے لے رہی تھیں۔مگر ان خدا کے بندوں نے میری نیند خراب کی۔جس روز پروفیسر وارد ہو جاتا ہے اس روز ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ باؤلا بن جاتا ہے۔

نجمہ: یہ تو ہمارے لیے عذاب بن گئے ہیں۔ایک دن دو دن ہو۔روز کا قصہ ہے۔صبح کو پوچھو تو ڈاکٹر صاحب تعجب سے کہیں گے کہ اچھا ایسا ہوا تھا۔

اطہر: غریب اپنے ہوش ہی میں نہیں ہوتے۔اصل میں خرابی پروفیسر کے ساتھ ہے۔

نجمہ: غریب۔اچھے تمہارے غریب ہیں (تھیلا اٹھا کر) اچھا جی میں کچن میں جا کر سر کھپاتی ہوں۔کہیں یہ لوگ پہلے ہی سے نہ آن بیٹھیں۔

اطہر: اوّل تو آئیں گے نہیں۔اگر وقت سے پہلے آ ہی گئے تو میں انھیں بھگتوں گا۔تم بے فکری سے اپنا کام کرو۔

[چلی جاتی ہے۔اطہر پھر ری ٹچنگ میں مصروف ہو جاتا ہے۔مرادعلی کے کمرے کا دروازہ پھر کھلتا ہے۔مرادعلی جھانک کر کمرے میں اردگرد نظر ڈالتے ہیں پھر اطہر سے مخاطب ہوتے ہیں۔]

مرادعلی: اطہر میاں۔

اطہر: (اسی طرح کام میں سر جھکائے ہوئے) جی ابا جان۔

مرادعلی: مصروف ہو؟

اطہر: جی ابا جان۔ان سب فوٹو گرافس کوٹھکانے لگانا ہے۔

مرادعلی: تومصروف ہوتم۔ٹھیک ہے اپنا کام کرو۔

[دروازہ اسی طرح کھلا چھوڑ کر اندر چلے جاتے ہیں۔اطہر تھوڑی دیر تک اسی طرح کام کرمیں غرق رہتا ہے پھراٹھ کے کھلے دروازے کی طرف جاتا ہے۔]

اطہر: (اندر جھانکتے ہوئے)۔ابا جان۔

مرادعلی: (اندر سے بآواز بلند) ہاں بیٹے کیابات ہے؟

اطہر: آپ مصروف ہیں؟

مرادعلی: ہاں تم مصروف ہوتو میں بھی مصروف ہوں۔

اطہر: آپ مصروف ہیں اچھا ٹھیک ہے۔آپ اپنا کام کیجیے۔

[واپس آ کر پھر ری ٹچنگ میں مصروف ہو جاتا ہے۔وقفہ۔مرادعلی پھر دروازے پر نمودار ہوتے ہیں۔]

مرادعلی: اطہر میاں۔

اطہر: جی ابا جان۔

مرادعلی: بیٹے میں زیادہ مصروف نہیں ہوں۔

اطہر: میں سمجھا کہ آپ نقل نویسی میں مصروف ہیں۔

مرادعلی: ہوں تو۔مگر آخر عجلت کیا ہے۔آج وہ کام نہیں ہوگا تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔

اطہر: اور آپ ان لوگوں کے نوکر تو نہیں ہیں۔

مرادعلی: اور کیا۔(رُک کر) مگر وہ دوسرا کام۔ضروری تو وہ کام ہے۔

اطہر: میں بھی۔یہی کہنے آیا تھا۔تو دروازہ کھولوں؟

مرادعلی: ہاں ہاں۔اور کیا۔

[اطہر عقبی دروازہ کھولتا ہے۔ دوسری طرف احاطہ میں جالی کے پیچھے طوطے، کبوتر، فاختائیں دکھائی دیتی ہیں۔ نیچے مرغیاں کٹ کٹ کرتی۔ خرگوش]

مراد علی: (احاطہ میں قدم رکھتے ہوئے مڑکر) تم بھی آرہے ہونا؟

اطہر: ہاں میں بھی آرہا ہوں۔ (آگے بڑھنے لگتا ہے کہ نجمہ کو داخل ہوتے دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے) ابا جان آپ چلیں میں ذرا اپنا کام نمٹا لوں۔

[واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ فوٹو گرافس اُلٹنے پلٹنے لگتا ہے]

نجمہ: (قریب آکر) میں یہ پوچھ رہی تھی کہ کھانے کا انتظام اسی کمرے میں کرلیں۔

اطہر: ہاں ہاں کیا مضائقہ ہے۔

نجمہ: کسی کسٹمر کو تو آنا نہیں ہے؟

اطہر: نہیں۔ آج کسی کی ڈیٹ نہیں ہے۔ شام کو ممکن ہے کوئی کسٹمر آ نکلے۔ تو ہم تو اس سے بہت پہلے فارغ ہولیں گے۔ تو میں سمیٹوں اپنا بکھیڑا۔

نجمہ: ابھی آپ کام کریں اپنا۔ اتنی جلدی کیا ہے۔

[واپس چلی جاتی ہے۔ وقفہ۔ مراد علی واپس دروازے میں نمودار ہوتے ہیں]

مراد علی: اطہر میاں۔

اطہر: جی ابا جان۔

مراد علی: بیٹے وہاں سے پانی کا ٹب ہٹانا پڑے گا۔

اطہر: میں کب سے کہہ رہا تھا آپ مانتے ہی نہیں تھے۔

[مراد علی واپس چلے جاتے ہیں۔ اطہر احاطہ کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ جانے کے لیے اٹھنے لگتا ہے کہ منی داخل ہوتی ہے۔ اٹھتے اٹھتے پھر رک جاتا ہے۔]

منی: (اطہر کو کرسی سے زبردستی اٹھاتے ہوئے) پاپا آپ جائیں۔ میری مرغابی اور اپنے پرندوں کو دیکھیں۔ یہ باقی کی ری ٹچنگ میں کرلوں گی۔ کیا آپ کو مجھ سے بھروسہ نہیں

ہے۔

اطہر: (کھڑے ہوتے ہوئے) اچھا کرو۔تم پہ پورا بھروسہ ہے۔مگر ڈر یہ رہتا ہے کہ کوئی بے احتیاطی نہ ہوجائے۔اورتمھاری آنکھوں پراس کااثر پڑے۔

منی: پاپا آپ اطمینان سے جائیں۔میں پوری احتیاط سے ری ٹچنگ کروں گی۔

اطہر: اچھاٹھیک ہے۔

[عقبی دروازے سے احاطہ میں نکل جاتا ہے۔ادھرمنی ری ٹچنگ کے کام میں مصروف ہوجاتی ہے۔وقفہ۔جاویدداخل ہوتا ہے]

جاوید: ارے منی تم۔کیا ہورہاہے۔ری ٹچنگ اوراطہر کہاں ہے۔

منی: پاپا احاطہ میں ہیں۔ذرامیری مرغابی سے ڈائی لوگ کررہے ہیں۔

جاوید: (غور سے دیکھتے ہوئے) اچھاتم ری ٹچنگ کرلیتی ہو۔خوب۔

منی: (اُٹھتے ہوئے) آپ بیٹھیے۔پاپا نے اپنا سارا بکھیڑا یہاں پھیلا رکھا ہے۔میں اٹھاتی ہوں۔

جاوید: بکھرا رہنے دو بکھیڑا۔کیا فرق پڑتا ہے۔

[منی فوٹو پرنٹس ہٹا کرایک طرف رکھتی ہے پھر کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔جاوید اسے ٹکٹکی باندھ کردیکھتا رہتا ہے۔]

جاوید: ارے بھئی ہاں۔وہ تمھاری مرغابی جو ہے۔وہ رات کوآرام سے سوئی رہی؟

منی: ہاں رات تو بہت آرام سے بے خبر سوئی رہی۔یہ پہلی رات تھی کہ وہ آرام سے سوئی۔ ورنہ بہت بے چین رہتی تھی۔بیچاری اکیلی ہے نا۔

جاوید: اکیلی؟

منی: ہاں بیچاری اکیلی ہے۔گھر سے بے گھر ہوگئی۔اس کے گھر والوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں ہے۔یہاں وہ غریب اجنبیوں میں آکر گھر گئی ہے۔

جاوید: یاں جیسے خرگوشوں کا جوڑا ہے۔ یا مرغیاں ہیں۔ ان کی ایک پوری برادری ہے اور مختلف مرغیوں نے بچے دے رکھے ہیں۔ ان کا اپنا اپنا فیملی ہے۔

منی: ہاں اور کیا۔ مگر بیچاری میری مرغابی۔ اس کا گھر نیا نیا چھٹا ہے۔ اور یہاں اس کا کوئی بھی نہیں ہے۔ سب اجنبی ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں کہ اس گھر کا یہ نیا باسی کہاں کا رہنے والا ہے۔ اور یہاں کیسے آیا ہے۔

[نجمہ داخل ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر جاوید اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔]

جاوید: میں شاید جلدی آ گیا۔

نجمہ: شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ میں اس فکر میں گھل رہی تھی کہ کہیں آپ کو دیر نہ ہو جائے۔ اور ہم انتظار میں گھلتے رہیں۔ ویسے کھانا تیار ہے۔ دو مہمانوں کا انتظار ہے۔ وہی ڈاکٹر اور پروفیسر۔

جاوید: اچھا اچھا۔

نجمہ: منی اب چھوڑو اس کام کو اور ذرا ڈائننگ ٹیبل درست کرو (ڈائننگ ٹیبل پر نظر ڈالتے ہوئے) ارے اس پر کیا کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا ہے۔

[دونوں مل کر ٹیبل درست کرتی ہیں۔ منی پرنٹس سمیٹی ہے۔ اس پر چادر بچھاتی ہے۔ احاطہ کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔]

جاوید: (گھبرا کر) یہ گولی کہاں چلی ہے؟

نجمہ: توبہ ہے۔ آج پھر شروع ہو گئے۔

(جاوید لپک کر عقبی دروازے پر جاتا ہے)

جاوید: (اونچی آواز سے) اطہر یہ یہاں گولی کیسے چلی ہے۔

اطہر: (جالی میں سے نکلتا ہے نظر آتا ہے۔ قریب آ کر) اچھا تم آ گئے۔

(پھر دونوں اندر آ کر بیٹھ جاتے ہیں)

کب آئے تم؟

جاوید: ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔

اطہر: sorry مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔تم یہاں خوامخواہ بور ہوتے رہے۔

جاوید: بالکل بور نہیں ہوا۔تمھاری بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔مگر یہ گولی کیسے چلی تھی۔

اطہر: یار تم گھبرا گئے۔وہ گولی تھی۔بس پٹاخہ سمجھ لو۔چڑیوں کو مارنے کا طمنچہ۔بس ہمارے ابا جان کی سنک ہے۔اس طرح وہ شکار کا شوق پورا کرتے ہیں۔

نجمہ: (کسی قدر غصے سے) یہ جو ابا جان اور تمھیں پستول چلانے کا شوق ہے اس سے کسی روز بڑا نقصان ہو جائے گا۔

اطہر: نجمہ میں نے کتنی مرتبہ تمھیں سمجھایا ہے۔یہ دیکھنے میں پستول ہے ویسے طمنچہ ہے۔

نجمہ: بہر حال مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں کسی روز کچھ ہو نہ جائے (پھر میز درست کرنے لگتی ہے۔)

نجمہ: اچھا میں کچن کو جا کر دیکھتی ہوں۔ویسے کھانا تیار ہے۔منی تم آؤ میرے ساتھ۔یہاں بیٹھ کر کیا کروگی۔کچھ میرا ہاتھ بٹاؤ۔(دونوں باہر نکل جاتی ہیں)

جاوید: یار تمھاری بیٹی تو ری ٹچنگ میں ماہر نظر آتی ہے۔

اطہر: اس کی ماں نے سکھایا ہے۔میں نے نہیں۔

جاوید: گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔پورا گھرانا فوٹوگرافی کے ہُنر میں طاق ہے۔

اطہر: سٹوڈیو کو میں نے انھی دونوں پر چھوڑ رکھا ہے۔میں تو اپنا کام کرتا ہوں۔

جاوید: اپنا کام؟ وہ کیا ہے۔

اطہر: ایک پروجیکٹ ہے۔

جاوید: کیسا پروجیکٹ ہے۔

اطہر: میں بس کوئی کمال کی چیز ایجاد کرنا چاہتا ہوں۔یہ میری زندگی کا مشن ہے۔

جاوید: واہ بے خبطی۔ تو موجد بنے گا۔ اے سبحان اللہ

اطہر: (افسردگی سے) میرا بوڑھا باپ اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ میں اسے کوئی خوشی دینا چاہتا ہوں۔ کوئی بڑی خوشی کہ اسے احساس ہو کہ بیٹے نے اس کا نام روشن کیا ہے۔ میں ایک بات بتاؤں۔

جاوید: ہوں۔

اطہر: اس مصیبت میں ایک ایسی گھڑی بھی آئی تھی کہ میرے باپ نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ لیا تھا۔

جاوید: اچھا؟ پھر؟

اطہر: میرے باپ نے ویسے تو سپاہی کی زندگی گذاری ہے۔ شکار بھی بہت کھیلا ہے مگر اپنے اوپر گولی چلانے کی اس میں ہمت پیدا نہیں ہوتی (رُک کر) مگر میرے ساتھ معاملہ مختلف ہوا۔

جاوید: کیا؟

اطہر: کیا تم یقین کرو گے کہ ایک گھڑی ایسی مجھ پر بھی آئی تھی۔

جاوید: میں بالکل یقین کروں گا۔ میں خود ایسے مرحلہ سے گذرا ہوں۔ اس وقت جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا۔ اچھا تم اپنا احوال سناؤ۔

اطہر: یار جاوید۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ فیصلہ کیا کہ مجھے زندہ رہنا چاہیے (خاموش ہو جاتا ہے)

جاوید: یار مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تیری حالت بھی اس مرغابی جیسی ہے

اطہر: (چکرا کر) مرغابی جیسی؟ (رُک کر) ٹھیک ہے۔ ایک شکاری کی گولی ادھر بھی آئی تھی۔ میرے باپ کے باپ کے بازو کو توڑ کر نکل گئی اور میرے بازو کو بھی۔

جاوید: مرغابی کو جب گولی لگتی ہے تو وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی جھیل کی تہہ میں اتر جاتی ہے۔ وہاں

ہوتی ہے دلدل۔ اور تاریکی۔ اسی دلدل میں پھنس جاتی ہے اور تاریکی میں جان دے دیتی ہے۔ بس تو بھی غوطہ لگا کر تہہ میں اُتر گیا ہے۔ اور تہہ میں اُگے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ اور دلدل میں پھنس گیا ہے۔ ایک زہریلی قسم کی دلدل میں۔ بلکہ بدبودار کیچڑ میں۔

اطہر: یار تو کیوں مجھے ڈرا رہا ہے۔

جاوید: کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ میں تجھے اس زہریلی دلدل سے اس بدبودار کیچڑ سے نکالوں گا۔ اب زندگی میں میرا بھی ایک مشن ہے اور کل ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ زندگی میں میرا کیا مشن ہو سکتا ہے۔

اطہر: ویسے میں تجھے ایک بات بتا دوں۔ میں ایک افسردہ روح ضرور ہوں۔ مگر میں اپنی جگہ مطمئن بھی ہوں۔

جاوید: یہ اطمینان جھوٹا ہے۔ اسی زہریلی دلدل نے یہ کیفیت پیدا کی ہے۔ جسے تو اطمینان کہتا ہے۔ تو بیماری کا شکار ہے۔

اطہر: بیماری، زہر، دلدل، کیچڑ۔ یہ کون سی زبان ہے۔ میں اس زبان کا عادی نہیں ہوں۔ میرا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ ایک محبت کرنے والی بیوی۔ ایک پیاری سی بیٹی۔ ایک بوڑھا دل شکستہ باپ ہم اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہے۔

[نجمہ اور منی داخل ہوتی ہیں۔ میز پر کھانا چنتی ہیں اس گھڑی ڈاکٹر فاروقی بھی داخل ہوتے ہیں۔]

نجمہ: بڑی عمر ہے آپ کی۔ میں یاد ہی کر رہی تھی۔ شکر ہے آپ وقت پر آ گئے۔

ڈاکٹر: ہمیں کھانے کی خوشبو آئی/ بس ہم دوڑ پڑے/۔

اطہر: ڈاکٹر صاحب آپ ہمارے دوست جاوید سے ملیں۔ جاوید یہ ڈاکٹر فاروقی ہیں۔

ڈاکٹر: (ہاتھ مِلاتے ہوئے) جاوید۔

اطہر: کب؟ کہاں؟

جاوید: ہاں شاید ہم مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر: شاید نہیں۔ یقیناً۔

نجمہ: اچھا باقی باتیں بعد میں۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔

ڈاکٹر: بالکل ٹھیک۔۔۔/ اوّل طعام/ بعد کلام/۔۔۔

پروفیسر: بس۔ بس۔

(سب بیٹھ جاتے ہیں کھانا شروع ہو جاتا ہے)

ڈاکٹر: میں نے سنا ہے کہ / آپ کا قیام اب یہیں رہے گا۔/

جاوید: صحیح سنا۔ اطہر نے عنایت کی کہ ایک کمرہ ہمیں دے دیا۔

ڈاکٹر: آپ کو ایک آرام رہے گا / ڈاکٹر کا / خاکسار نے آپ کے کمرے کے برابر ہی ڈیرا ڈال رکھا ہے۔

جاوید: اچھا کیا بتا دیا۔ آپ کی ضرورت کسی وقت بھی پڑ سکتی ہے۔ کل ہم جس دعوت میں پہنچے ہوئے تھے وہاں تیرہ مہمان تھے۔ تیرہ کیسا ہندسہ ہے۔ آپ جانتے ہیں۔

اطہر: پھر بدشگونی کی بات۔ چھوڑو یہ ذکر۔ کھانا کھاؤ۔

جاوید: (کھاتے ہوئے) میجر انکل کہاں ہیں۔ انھیں ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھانا تھا۔

اطہر: وہ اپنے کمرے میں رہتے ہیں وہیں کھانا کھاتے ہیں۔

ڈاکٹر: / بھئی رات اپنے پروفیسر نے بہت غل غپاڑہ کیا/

نجمہ: پھر؟ اچھا؟ مجھے پتہ نہیں چلا۔

ڈاکٹر: گھوڑے بیچ کر ہی سوئی ہوں گی / ورنہ موصوف نے تو یاروں کی نیند خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ / برا حال تھا موصوف کا۔

اطہر: اچھا؟ یار تمہارا دوست غلط آدمی ہے۔

ڈاکٹر: اچھا خیر/(جاوید سے) جاوید صاحب/وہ جو آپ نے کلیم داخل کیا تھا/اس کا کیا بنا؟

جاوید: (چکرا کر) کلیم۔۔۔۔؟ (سوچ کر کچھ سمجھتے ہوئے) اچھا، اچھا۔

اطہر: تم نے کوئی کلیم داخل کیا تھا؟

ڈاکٹر: ہاں ایک کلیم انھوں نے داخل کر رکھا تھا/ آئیڈیل کا کلیم/ تو کوئی آئیڈیل الاٹ ہو ہے آپ کے نام/؟(joking)

جاوید: (ہنس کر) وہ جوانی کی ترنگ تھی۔ ناتجربہ کاری آئیڈیل کی تلاش بے سود ہے۔

ڈاکٹر: (قہقہہ لگا کر)/جلدی عقل آ گئی/۔

اطہر: ڈاکٹر جانے بھی دو۔ کھانا کھاؤ۔

ڈاکٹر: /یار آج کتنے دنوں بعد ہم اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں/ تم ہمیں ہنسنے بھی نہیں دیتے/ ایسی محفل جمی ہو تو ذرا لطف آتا ہے/

جاوید: لطف؟ مجھے نہیں آتا۔

ڈاکٹر: اچھا؟/ کیوں/؟

جاوید: مجھے ایسا لگتا ہے کہ کہیں دلدل سے (منہ بگاڑ کر) کیچڑ اور اس سے انجدات اُٹھ رہے ہوں۔ بو کے بھبھکے۔

ڈاکٹر: (چکرا کر)/انجدات/؟

اطہر: یار تو نے پھر وہی دلدل، کیچڑ والی زبان بولنی شروع کر دی۔

نجمہ: جاوید صاحب اس گھر میں کیچڑ کا نام و نشان نہیں ہے ۔ پتہ نہیں آپ کو بُو کا بھبھکا کہاں سے آ رہا ہے۔ میں روز صبح اُٹھ کر پوری صفائی کرتی ہوں۔ سارے دروازے کھڑکیاں کھول دیتی ہوں کہ تازہ ہوا آئے۔

جاوید: اچھا کرتی ہو۔ مگر جس نجاست کا میں ذکر کر رہا ہوں ایسے جھاڑ پونچھ دور نہیں کر سکتی۔

نجمہ: نجاست؟ (اطہر سے) اطہر سن رہے ہو۔

ڈاکٹر: گستاخی معاف/وہ نجاست کہیں آپ ہی تو لے کر نہیں آئے۔

جاوید: میں اس گھر میں کیا لے کر آیا ہوں۔ یہ۔۔۔۔۔

ڈاکٹر: /بس بس/ ؎ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

(اُٹھ کر جاوید کے قریب جاتا ہے)

ڈاکٹر: جاوید صاحب سنیے/ کان کھول کر سنیے/ میرا خیال ہے کہ جیسے آپ جوانی کی ترنگ کہہ رہے تھے/ بلکہ جوانی کا خبط کہیے/ وہ ابھی آپ کے دماغ سے گیا نہیں ہے/ میرا مطلب ہے/ کہ آپ کے دماغ میں جو آئیڈیل کی بُو بسی ہوئی ہے/

جاوید: ہاں وہ تو میرے دم کے ساتھ ہے۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔

ڈاکٹر: آپ اسے بے شک سینے سے لگائے رکھیے/ مگر ہمیں تو اس سے بو رمت کیجیے۔/ ورنہ پھر۔۔۔(کہتے کہتے رُک جاتا ہے)

جاوید: ورنہ پھر کیا ہوگا؟

ڈاکٹر: یہ ہوگا کہ آپ لڑھکتے/ قلا بازیاں کھاتے/اس کمرے سے برآمدے میں نظر آئیں گے۔

اطہر: (گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے) ڈاکٹر صاحب۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

جاوید: ٹھیک ہے آپ مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیں۔

نجمہ: ڈاکٹر صاحب۔ آپ کو ایسا لہجہ زیب نہیں دیتا۔ اور جاوید صاحب آپ سے بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ اپنے کمرے میں جو آپ نے کیچڑ کر ڈالی ہے۔ اس کے بعد کیچڑ اور بُو کے بھبھکوں کی بات کرنی نہیں چاہیے تھی۔ آپ کو۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے۔)

منی: امی باہر کوئی ہے۔

نجمہ: جا کر دیکھتی ہوں۔

[اُٹھ کر داخل ہونے والے دروازے پر جاتی ہے۔ دروازہ کھولتی ہے تو سیٹھ غنی کھڑا نظر آتا ہے۔ اسے دیکھ کر سٹپٹا جاتی ہے۔]

نجمہ: آیئے آیئے۔

سیٹھ غنی: بے وقت۔ بے اطلاع آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ مگر مجھے پتہ چلا ہے کہ ہمارے صاحبزادے یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

نجمہ: (گھبرا کر) جی ہاں۔

اطہر: (قریب آ کر) انکل آپ نے غریب خانے کو نوازا ہے۔ تو اندر تشریف لائیں اور ہمارے ساتھ۔۔۔۔۔

سیٹھ: شکریہ۔ بس میں جاوید سے ڈیڑھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

جاوید: (قریب آ کر) فرمایئے۔ میں حاضر ہوں۔

سیٹھ: یہاں نہیں اپنے کمرے میں چلو۔

جاوید: شوق سے چلیئے۔

نجمہ: نہیں نہیں۔ وہاں نہیں۔

جاوید: کیوں نہیں؟

نجمہ: وہاں تو بہت گند بلا پھیلی ہوئی ہے۔

اطہر: آپ اسی کمرے میں تشریف رکھیں۔ ابھی تخلیہ ہو جاتا ہے۔ (ڈاکٹر اور پروفیسر سے) چلیئے ہم لوگ یہاں سے نکل کر برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔

[سب نکل جاتے ہیں جاوید اور سیٹھ آگے بڑھ کر آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔]

جاوید: لیجیے۔ اب کوئی نہیں۔ ارشاد۔

سیٹھ: تم نے کل جو باتیں کیں اور جو اُٹھ کر اس گھر میں چلے آئے اسے میں کیا سمجھوں۔

جاوید: میں چاہتا ہوں کہ اطہر کی آنکھیں کھل جائیں۔ اسے اپنی پوزیشن کا پتہ چل جانا چاہیے۔

سیٹھ: تم جو کل مشن کی بات کر رہے تھے تو گویا یہ ہے تمھاری زندگی کا مشن۔

جاوید: آپ نے کسی اور کام کے لائق مجھے رہنے ہی نہیں دیا۔ جو حالات آپ نے پیدا کر دیے

ہیں ان میں میرا مشن لے دے کے یہی ہو سکتا ہے۔

سیٹھ: تمہارے دماغ کو مفلوج کس نے کیا ہے؟ میں نے؟ یا تمھاری مرحوم ماں نے؟

جاوید: آپ نے میری پوری زندگی مفلوج کر کے رکھ دی ہے۔ ممی نے نہیں۔ آپ نے۔ یہ آپ کی وجہ سے ہے کہ مجھے میرا مجرم ضمیر مستقل ملامت کرتا رہتا ہے۔ مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔

سیٹھ: اچھا تو تمھارا ضمیر تمھیں پریشان رکھتا ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا۔

جاوید: آپ جب میجر انکل کے لیے جال بچھا رہے تھے تو مجھے آپ کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہو جانا چاہیے تھا۔ اور میجر انکل کو خبردار کر دینا چاہیے تھا کیونکہ میں نے کچھ بھانپ تو لیا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والے ہے۔

سیٹھ: پھر تم بولتے۔ اس وقت کیوں نہیں بولے۔

جاوید: اس وقت میں بزدل تھا۔ آپ کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ ڈرتا تھا۔ بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

سیٹھ: تو گویا اب تم نے اس خوف پہ غلبہ پالیا ہے۔ اب خیر سے تم بہادر ہو گئے ہو۔ اور نامِ خدا تم باپ کو للکار سکتے ہو۔

جاوید: آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ مگر اب میری بہادری کس کام کی جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میجر انکل کے ساتھ جو زیادتی، جو ظلم ہوا ہے۔ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اطہر جس جھوٹ اور جس فریب میں گھِرا ہے اور جس سے اس کی تباہی یقینی ہے اس کا پردہ تو چاک کیا جا سکتا ہے۔

سیٹھ: تمہارا خیال ہے کہ تم اطہر کے ساتھ نیکی کرو گے۔

جاوید: بلاشبہ۔

سیٹھ: تمہارا خیال ہے کہ ہمارا ہونہار فوٹو گرافر تمہارے اس دوستانہ سلوک کی قدر کرے گا۔ تمہارا ممنون احسان ہو گا۔

جاوید: بالکل۔

سیٹھ: اچھا دیکھوں گا۔

جاوید: پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو مجھے اپنے ضمیر کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا ہو

گا۔

سیٹھ: تمہارا ضمیر اسدا کا بیمار ہے۔ بچپن کے زمانے سے تمھیں یہی بیماری لگی ہوئی ہے تمھاری ماں کا عطیہ ہے۔ لے دے کر یہی وراثت تو اس نے تمہارے لیے چھوڑی ہے۔

جاوید: (تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) آپ نے میری ماں کا وہ قصور ابھی تک معاف نہیں کیا۔

سیٹھ: کون سا قصور؟

جاوید: وہ جو آپ نے ایک توقع باندھی تھی بلکہ فرض کر لیا تھا کہ میری ماں جہیز میں لمبی چوڑی جائیداد لے کر آئے گی۔ وہ توقع پوری نہیں ہوئی یہی اس کا قصور تھا نا؟

سیٹھ: ان فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ تو مطلب ہے کہ جسے تم مشن فریضہ سمجھ رہے ہو۔ یعنی اطہر کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا فریضہ۔ اس سے تم باز نہیں آؤ گے؟

جاوید: یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔

سیٹھ: پھر تو میں نے یہاں آ کر اپنا وقت ہی ضائع کیا۔ آپ سے پوچھنا بیکار ہے کہ تم واپس گھر آنے کا ارادہ رکھتے ہو یا نہیں۔

جاوید: جی بالکل بیکار۔

سیٹھ: اور تم شاید فرم میں بھی شریک ہونے کی نیت نہیں رکھتے؟

جاوید: نہیں۔

سیٹھ: ٹھیک ہے۔ بہرحال مجھے ایک فریضہ تو ادا کرنا ہی ہے۔ چونکہ میں نئی شادی کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اس لیے قانون کی رو سے جائیداد کا جو حصہ تمھیں پہنچنا چاہیے۔ اس کی میں لکھا پڑھی کیے دیتا ہوں۔ میں تمہارا حق مارنا نہیں چاہتا۔

جاوید: نہیں مجھے آپ کی جائیداد سے کوئی حصہ نہیں چاہیے۔

سیٹھ: نہیں چاہیے؟

جاوید: نہیں میں جائیداد کی خاطر ضمیر کا سودا نہیں کر سکتا۔

سیٹھ: پھر کیا کرنے کا ارادہ ہے۔

جاوید: مجھے اپنے مشن پورا کرنا ہے اور بس۔

سیٹھ: اوراس کے بعد؟ آخرگذارے کے لیےبھی تو کچھ کرو گے؟

جاوید: میں نے اپنی تنخواہ سے تھوڑی سی بچت کر لی ہے۔

سیٹھ: وہ کتنے دن چلے گی۔

جاوید: جتنے دن میں نے جینا ہے۔اتنے دن کے لیے وہ رقم بہت کافی ہے۔

سیٹھ: (تشویش سے)اس کا کیا مطلب ہے؟

جاوید: اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

سیٹھ: اچھا خوش رہو(نکل جاتا ہے)

جاوید: (اندرجھانک کر)انکل چلے گئے۔

اطہر: ہاں اب آپ لوگ آسکتے ہیں۔

[اطہر اور ڈاکٹر داخل ہوتے ہیں۔ باورچی خانے کی سمت سے نجمہ اور منی بھی آن وارد ہوتی ہیں۔]

جاوید: اطہر کوٹ پہنو اور میرے ساتھ چلو۔

اطہر: کہاں؟

جاوید: یہ مت پوچھو۔لمبی ٹہل کرنی ہے۔

اطہر: ہاں چلتا ہوں ویسے تمہارے ڈیڈی نے کیا بات کی تم سے۔کچھ میرے متعلق؟

جاوید: بس یہاں سے نکلو۔بات کریں گے اور میں بھی ذرا جا کر اپنا اوورکوٹ سنبھال لوں۔ (نکل جاتا ہے)

نجمہ: تمھیں جاوید کے ساتھ نہیں جانا ہے۔

ڈاکٹر: بھابھی ٹھیک کہتی ہیں/ تمھیں اس وقت اس شخص کے ساتھ نہیں جانا چاہیے/

اطہر: (اوورکوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے)جاوید میرا یار ہے۔وہ مجھ سے تنہائی میں اپنے دل کا حال کہنا چاہتا ہے۔میں کیسے انکار کرسکتا ہوں۔

ڈاکٹر: مگر تم دیکھ نہیں رہے/وہ اپنے آپے میں نہیں ہے/بالکل جنونی بنا ہوا ہے۔/

نجمہ: اس کی ماں پہ بھی ایسے ہی دورے پڑا کرتے تھے۔

اطہر: پھر تو میرا اور بھی یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اس کی خبر گیری کروں (نجمہ سے) رات کے کھانے

کا بندوبست کر لینا۔ اس وقت تک ہم ضرور لوٹ آئیں گے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں (نکل جاتا ہے)

ڈاکٹر: یہ کمبخت واپس کیوں آیا/ دفع ہو گیا تھا تو وہیں کہیں مر کھپ جاتا۔/

نجمہ: ڈاکٹر صاحب۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر: /میں کچھ سوچ کر ہی ایسی بات کہہ رہا ہوں۔/

نجمہ: ڈاکٹر صاحب کیا خیال ہے آپ کا کیا واقعی جاوید کا دماغ چل گیا ہے؟

ڈاکٹر: نہیں/ یہ اس سے بھی زیادہ خراب صورت حال ہے/ میں نے اس سے زیادہ پاگل مریض دیکھے ہیں/ مگر جو مرض اسے لاحق ہے/ وہ پاگل پن سے زیادہ سنگین ہے۔/

نجمہ: (پریشان ہو کر) وہ کیا ہے؟

ڈاکٹر: /اسے ضمیر کا مرض لاحق ہے۔/

نجمہ: (چکرا کر) ضمیر کا مرض؟۔۔۔۔ یہ بھی کوئی بیماری ہے۔

ڈاکٹر: ہاں یہ اصل میں قومی بیماری ہے۔/ پوری قوم اس میں مبتلا ہے۔/ بس ایک ساتھ دورہ پڑتا ہے۔/ (چلتے ہوئے)/ اچھا بھابی۔/ مہمان نوازی کا شکریہ۔/

نجمہ: (پریشانی میں ٹہلتی ہے، بڑبڑاتی ہے) اف۔ یہ نحوست مارا شروع ہی سے ایسا تھا۔

منی: (حیران پریشان نظر آتی ہے) امی یہ کیا ہو رہا ہے؟

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

[اطہر کا وہی بڑا کمرہ جو سٹوڈیو بھی ہے۔ اس وقت وہ سٹوڈیو زیادہ نظر آرہا ہے۔ کیمرہ جس پر سیاہ کپڑا پڑا ہوا ہے۔ دو کرسیاں، فولڈنگ ٹیبل وغیرہ۔ یہ شام کا وقت ہے۔ نجمہ ایک بھیگا پرنٹ ہاتھ میں لیے دروازے پر کھڑی ہے۔ اور برآمدے میں کھڑے کسی شخص سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ شخص نظر نہیں آرہا]

نجمہ: پکی بات پیر کو آپ کو تصویریں تیار ملیں گی۔ دیکھیے میں جھوٹا وعدہ نہیں کرتی۔ پکی بات

ہے۔ پیر کے دن ۔۔۔۔ ہاں اطمینان رکھیے۔

[رخصت کر کے پلٹتی ہے اس گھڑی منی باورچی خانے کی طرف سے داخل ہوتی ہے] □

منی: وہ صاحب گئے؟

نجمہ: (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) ہاں ۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ بعض بعض کسٹمر تو بس چمٹ جاتا ہے۔ کتنی مشکل سے اسے رخصت کیا ہے۔

منی: امی، پاپا ابھی تک نہیں آئے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔

نجمہ: وہ آ کر ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں بھی تو بیٹھ جاتے ہیں۔ کہیں وہیں بیٹھے باتیں نہ کر رہے ہوں۔

منی: نہیں وہاں نہیں ہیں۔

نجمہ: اتنی دیر تو وہ باہر رہا نہیں کرتے۔ اب تو شام ہو رہی ہے۔ میرے خیال سے آتے ہی ہوں گے۔

منی: جلدی سے آ جائیں مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے پتہ نہیں کیا بات ہے۔

نجمہ: بیٹی ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ آدمی جب باہر نکلتا ہے تو سو طرح کی مصروفیتیں نکل آتی ہیں۔ دیر سویر ہو جاتی ہے۔

[قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ۔۔۔۔[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں]

نجمہ: (خوش ہو کر) لو دیکھ۔ وہ آ گئے۔

منی: (دوڑ کر اطہر سے لپٹ جاتی ہے) پاپا آپ کہاں تھے؟

نجمہ: اطہر تم کہاں رہ گئے تھے۔ دوپہر کے گئے اب شام کو آئے ہو۔ منی تمھیں یاد کر کر کے پریشان ہو رہی تھی۔

[اطہر کے چہرے سے کچھ پریشانی، کچھ بیزاری عیاں ہے اور یہ کہ کسی قدر تنا ہوا ہے۔ نجمہ سے آنکھیں نہیں ملا رہا۔ اس کی باتوں کا جواب رُوکھے پن سے دیتا ہے۔ اوورکوٹ اور مفلر اور جوتے اتارنے لگتا ہے]

اطہر: ہاں دیر ہوگئی۔

نجمہ: بہت تھکے ہوئے نظر آرہے ہو۔ چائے بناتی ہوں۔

اطہر: (اسی سوکھے پن سے) نہیں۔

منی: (قریب جاکر غور سے دیکھتے ہوئے) پاپا۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

اطہر: اچھی ہے۔ کیوں؟

منی: آپ کچھ۔۔۔۔۔(سمجھ نہیں آتا کیا کہیے)

اطہر: صرف تھکن ہے۔ پیدل بہت چلا ہوں۔ ٹہل کچھ لمبی ہوگئی۔

نجمہ: تو اتنی لمبی واک (walk) نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تم زیادہ پیدل چلنے کے عادی تو نہیں ہو۔

اطہر: کتنی باتوں کے ہم عادی نہیں ہوتے۔ مگر عادی ہونا پڑتا ہے۔ دنیا کا طور بھی کچھ ایسا ہے ۔کیا کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے (بات بدل کر) کوئی نیا آرڈر؟

نجمہ: کوئی نہیں۔ ایک پرانا کسٹمر تقاجا کرتا ہوا آیا تھا۔ کمبخت دماغ چاٹ گیا۔ کسی نئے نے تو جھانک کر نہیں دیا۔

اطہر: بہت لاپروائی برتی۔ کل سے میں جم کر بیٹھوں گا سارا کام خود سنبھالوں گا۔

منی: پاپا آ بھول گئے۔ کل میری سالگرہ ہے۔

اطہر: اچھا کیا یاد دلا یا دیا۔ بہرحال پرسوں سے کام میں خود سنبھالوں گا۔

نجمہ: تم پہ کاموں کا بوجھ پہلے کم ہے۔ آخر میں کام چلا ہی رہی ہوں۔ اس میں تمھیں کیا خرابی نظر آتی ہے۔

منی: اور پاپا آپ ادھر لگ گئے تو میری مرغابی کی خبر کون لے گا۔ مرغیاں، خرگوش، بطخیں، وہ سب کیا کریں گی۔

اطہر: یہ سب فضولیات ہیں خبردار جواب ان میں سے کسی کا نام میرے سامنے لیا۔ اور مرغابی۔ اس کی تو گردن مروڑنے کو جی چاہتا ہے۔

منی: (بدحواس ہوکر) پاپا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں میری مرغابی ہے۔

اطہر: تمھاری سمجھ کی ہی چھوڑے دے رہا ہوں ورنہ اس ذلیل مکار آدمی کے گھر سے آئی ہوئی چیز۔ کسی کا اس پر سایہ بھی پڑ جائے تو اسے زندہ نہ چھوڑوں۔

منی: (بسورتے ہوئے) مگر پاپا وہ تو بیچاری مرغابی ہے۔ اس کی کیا خطا ہے۔

اطہر: میں نے کہہ دیا نا کہ مرغابی کو میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ تم نے اسے اپنا لیا ہے۔ سمجھ گئیں۔ ورنہ میں اسے چھوڑتا نہیں (رُک کر) اچھا منی اب ایسا کرو کہ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ جا کر آرام کرو۔ میں کچھ حساب کتاب کرنا چاہتا ہوں۔

منی: نہیں پاپا۔ میں آپ کے پاس بیٹھوں گی۔

اطہر: نہیں بیٹی ضد نہیں کرتے۔ اپنی آنکھوں کو بھی تھوڑا آرام لینے دیا کرو۔ یہاں انجرات اٹھ رہے ہیں تمھاری آنکھوں کو نقصان پہنچائیں گے۔

نجمہ: (چونک کر) انجرات۔ کیا کہہ رہے ہو؟

اطہر: (منی سے قدر درشتی سے) سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا ہے۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔
[منی بے دلی سے اٹھتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ اطہر بے کلی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے۔]

اطہر: (ٹہلتے ٹہلتے اچانک رُک کر) نجمہ۔

نجمہ: (غور سے اسے دیکھتے ہوئے) ہاں۔ کیا بات ہے؟

اطہر: کل سے ۔۔۔ نہیں میرا مطلب ہے پرسوں سے گھر کا حساب میں سنبھالوں گا۔

نجمہ: اچھا؟ ٹھیک ہے۔

اطہر: میری تو اتنی آمدنی نہیں ہے۔ اتنی فراخدلی سے جو تم خرچ کرتی ہو۔ یہ پیسہ آتا کہاں سے ہے۔

نجمہ: (غور سے اطہر کو دیکھتے ہوئے) اطہر۔ یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو۔

اطہر: (سختی سے) میری بات کا جواب دو۔ یہ اللے تللے کیوں؟ کیسے؟

نجمہ: اس لیے کہ میں اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتی ہوں۔ تم دیکھتے نہیں ہو دوسروں کی بیویوں کو۔ جسے دیکھو سونے میں پیلی ہو رہی ہے اور روز نیا جوڑا چاہیے۔ ایک سے بڑھ کر ایک اور اوپر سے سرخی پاؤڈر۔ ایسی بیوی ملی ہوتی تو پھر پتہ چلتا۔ جو ہمیں بیٹی ملی ہے۔ وہ اپنی جگہ مسکین ہے ورنہ آج کل کی لڑکیاں۔ توبہ۔ ان کی فرمائشیں ہی ختم نہیں ہوتیں۔

اطہر: بس بس کافی ہے۔

نجمہ: تم نے پوچھا تھا تو میں نے بتایا۔

اطہر: تو گویا یہ اللے تللے اس وجہ سے ہیں کہ تم اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتیں۔ گھر پہ لگاتی ہو۔ مگر ابا جان کو جو نقل نویسی کی اُجرت ملتی ہے۔ وہ بھی تو شاید وہ تمہارے ہی حوالے کر دیتے ہیں اور میرے کان میں بھنک پڑی ہے کہ سیٹھ صاحب ان کی اُجرت کے معاملہ میں کچھ زیادہ ہی فراخدلی دکھاتے ہیں۔ شاید یہ اللے تللے اس فراخدلی کا کرشمہ ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ وہ بخیل آدمی۔ پیسوں کو دانتوں سے پکڑنے والا ابا جان کے معاملے میں فراخدل کیسے ہو گیا۔

نجمہ: (تنگ آ کر) مجھے کیا پتہ۔۔۔ یہ ابا جان سے پوچھو۔ ممکن ہے۔ پرانے تعلقات کا لحاظ کر کے۔۔۔۔

اطہر: (بات کاٹتے ہوئے) پرانے تعلقات۔۔۔۔ (معنی خیز لہجہ میں) کس کے ساتھ پرانے تعلقات۔

نجمہ: اطہر تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ دن دن میں کیا انقلاب آ گیا۔ جیسے بالکل ہی بدل گئے ہو۔ یہ جو تمہارا دوست آیا ہے۔ لگتا ہے کہ اس نے تمہارے کان میں کچھ پھونکا ہے۔

اطہر: یا یوں کہو کہ میری آنکھوں پر جو پردے پڑے ہوئے تھے وہ اُٹھ گئے ہیں۔

نجمہ: (جذباتی انداز میں) تمھیں میری جان کی قسم۔ مجھے بتاؤ کہ اتنی دیر جو جاوید تمہارے ساتھ رہا ہے۔ کیا باتیں کرتا رہا۔ میرے بارے میں اس نے تم سے کیا کیا کہا ہے؟

اطہر: مجھے تم ایک بات کا جواب دو۔ کیا یہ درست ہے کہ جن دنوں تم وہاں ملازمت کر رہی تھی۔ ان دنوں تمہارے اور اس شخص کے درمیان۔

نجمہ: (بات کاٹتے ہوئے) یہ غلط ہے۔ اس کی طرف سے ضرور پیش قدمی ہوئی تھی لیکن میں نے اس شخص کو کوئی لفٹ نہیں دی۔ ہاں وہ عورت سخت شکی تھی۔ وہ طوفان اُٹھایا کہ الٰہی توبہ۔ میں نے استغفار کیا۔

اطہر: اور اس کے بعد کیا ہوا؟

نجمہ: اس کے بعد کیا ہوا تا۔ میں گھر بیٹھ گئی۔ اور میری ماں جو تم سمجھتے ہو۔ ویسی نہیں ہے۔ میری ماں۔ وہ مجھ پر کڑی نظر رکھتی تھی کیونکہ سیٹھ بھی اب فارغ تھا۔ وہ عورت اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

اطہر: اچھا پھر؟

نجمہ: کچھ ہوتو بتاؤں۔

اطہر: تمہارے ہاتھ کیوں کانپ رہے ہیں۔اور چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔

نجمہ: کوئی بھی نہیں۔ میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اس نے میرا پیچھا بہت کیا۔مگر میں نے اسے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ پھر اسے زرینہ مل گئی۔ وہ اس سے لگ گیا۔ میں نے شکر کیا کہ بلا ٹلی۔

اطہر: (تلخی سے) تو یہ ہے میری بیٹی کی ماں۔ اصلی چہرہ اب نظر آیا ہے۔تم نے یہ ساری بات مجھ سے چھپائی کیوں۔

نجمہ: میں آخر کیا بتاتی۔

اطہر: (غصے سے قریب پڑی میز کو ٹھوکر مارتے ہوئے) تو یہ ہے جو میں نے گھر بسایا ہے اس کے لیے میں اس ذلیل کمینے شخص کا مرہونِ منت ہوں۔

نجمہ: اطہر ہم نے پندرہ برس اکھٹے گذرے ہیں۔ کتنی خوشگوار زندگی تھی ہماری۔تم اس خوشگوار زندگی پر پچھتا رہے ہو۔

اطہر: اور تم نے جو میرے گرد مکر وفریب کا جال بُنا تھا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔کیا تمہارا ضمیر تمھیں ملامت نہیں کرتا تھا۔ضرور کرتا ہوگا۔

نجمہ: خدا غارت کرے اس منحوس کو۔کس بری گھڑی میں اس ہمارے گھر میں قدم رکھا تھا۔

اطہر: گھر۔ میں واقعی یہ سمجھ رہا تھا کہ ہمارا گھر ایک چھوٹی سے جنت مکروہ دھوکا تھا۔فریب تھا۔ میں برباد ہو گیا۔کس سکون کس یکسوئی کے ساتھ میں اپنے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ میں نے کیا خواب دیکھا تھا۔میرا خواب پارہ پارہ ہو گیا۔اب میں اسے سینہ پہ رکھ کر قبر میں اُتر جاؤں گا۔

نجمہ: چلا کر مت نکلوایسی منحوس بات منہ سے۔

[دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔جاوید جھانکتا ہے)

جاوید: میں اندر آسکتا ہوں۔

اطہر: آؤ۔آؤ۔

[جاوید اندر آتا ہے۔ وہ بہت مطمئن نظر آتا ہے۔ باری باری نجمہ اور اطہر کے چہروں کو غور سے دیکھتا ہے۔]

جاوید: (اطہر سے) تو ابھی تم نے۔۔۔۔۔

اطہر: اس کے بعد میں کتنی دیر ضبط کر سکتا تھا۔

جاوید: گویا تم۔۔۔۔

اطہر: ہاں۔ بس میں پھٹ پڑا۔ میری زندگی کی یہ سب سے تلخ گھڑی تھی۔

جاوید: مگر اس کے ساتھ تمہارے یہاں ایک اخلاقی بلندی کا احساس پیدا ہوا ہوگا۔

اطہر: اس کا تو پتہ نہیں۔

نجمہ: (تلخی سے) جاوید اور تو میں کیا کہوں۔ بس تمھیں خدا ہی سمجھے۔

جاوید: (حیرت سے) میں سمجھا نہیں اس کا مطلب۔

اطہر: کیا نہیں سمجھے؟

جاوید: اتنی کٹھن گھڑی سے گذرنے کے بعد، بلکہ اس کٹھن گھڑی کے کو ایک نئی زندگی کا حرفِ آغاز ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایسے رشتے کا حرفِ آغاز جس کی بیناد سچائی پر ہو جس میں کسی کی دغا فریب کا دخل نہ ہو۔

اطہر: (بیزاری سے) ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔

جاوید: میں نے جب اس کمرے میں قدم رکھا تھا۔ تو مجھے کس قدر یقین تھا میں ایک نیا عالم دیکھوں گا۔ ایک تجلی۔ میاں بیوی دونوں کی قلب ماہیت ہو چکی ہوگی۔ ان کے چہرے نور سے دمک رہے ہوں گے۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے ہے۔ افسردگی بیزاری۔ پژمردگی۔۔۔

نجمہ: (زہرناک لہجے میں) سبحان اللہ۔ تم سے باتیں بنانی تو خوب آتی ہیں۔

جاوید: نجمہ بھابھی۔ آپ کی سمجھ میں میری بات نہیں آ رہی۔ شاید ابھی نہیں آئے گی۔ مگر رفتہ رفتہ آپ کو پتہ چلے گا کہ۔۔۔۔۔ مگر اطہر میں سمجھتا ہوں کہ اس بحران سے گذرنے کے بعد تمہارے یہاں آنی چاہیے۔ خطا کرنے والے کو معاف کر دینے میں جو بڑائی ہے اور اس سے جو خوشی میسر آتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔

اطہر: کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ جو تلخ گھونٹ میں نے پیا اس کی تلخی اتنی جلدی زائل ہو جائے گی۔

جاوید: عام آدمی تو واقعی اتنی جلدی ایسی تلخی کو فراموش نہیں کر سکتا۔ مگر تم آدمی تو نہیں ہو۔ تم سے توقع یہ تھی کہ۔۔۔۔

اطہر: (بات کاٹتے ہوئے) ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں لیکن اس کے لیے وقت چاہیے۔

جاوید: اطہر تمہارے اندر ایک زخمی مرغابی چھپی بیٹھی ہے۔

ڈاکٹر: (داخل ہوتے ہوئے) /اچھا مرغابی کا قصہ پھر سے شروع ہو گیا/

جاوید: ہاں اس مرغابی کا جو سیٹھ غنی محمد کی گولی کھا کر پھڑک رہی ہے۔

ڈاکٹر: /اچھا تو سیٹھ صاحب زیرِ بحث ہیں / (ایک ایک کو غور سے دیکھتا ہے پھر جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے حقارت سے) شیطان خبیث روح۔

اطہر: ڈاکٹر صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

ڈاکٹر: میں ٹھیک کہہ رہا ہوں / میرا دل کہتا ہے کہ اس عطائی کو یہاں سے دفع ہو جانا چاہیے۔ نہیں تو یہ بد بخت تم دونوں کی زندگی میں زہر گھول دے گا۔

جاوید: ڈاکٹر صاحب ان دنوں کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں زہر گھول دیں گے۔ ہرگز نہیں۔ اطہر کو تو ہم آپ جانتے ہی ہیں۔ مگر نجمہ بھابھی کے بارے میں بھی اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اندر ایک خلوص ہے، وفا ہے۔ محبت بھرا دل۔

نجمہ: (رقعت بھرے لہجے میں) جاوید۔ اچھا ہوتا کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دیتے۔

ڈاکٹر: جاوید صاحب / میں گستاخی کی واقعی معافی چاہتا ہوں / کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے / کہ اس گھر کے ساتھ آپ کیا واردات کرنا چاہتے ہیں۔ /

جاوید: میں اس گھر میں صحیح اور سچی ازدواجی زندگی کی بنیاد رکھنا چاہتا ہوں۔

ڈاکٹر: تو گویا آپ سمجھتے ہیں / کہ اطہر کی ازدواجی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر ہے /

جاوید: میں سمجھتا ہوں کہ اس میں صداقت کا رنگ بھرا جا سکتا ہے۔

اطہر: ڈاکٹر صاحب! شاید آپ نے یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ مثالی شادی کیا ہوتی ہے اور مثالی ازدواجی زندگی کیسی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر: (تحقیر سے) مثالی شادی / مثالی ازدواجی زندگی / سب بکواس ہے / (جاوید سے) جاوید

صاحب معاف کرنا۔آپ نے زندگی میں مثالی شادیاں یا سچی شادیاں جو کچھ بھی ہے / کتنی دیکھی ہیں/

جاوید: مشکل سے ایک ڈیڑھ۔

ڈاکٹر: غلط/ایک ڈیڑھ بھی نہیں دیکھی ہوگی/

جاوید: میں نے غلط شادیاں بہت دیکھی ہیں۔ایسی شادیاں جن کی بنیاد جھوٹ پر ہوتی ہے اور پھر جوان کا انجام ہوتا ہے۔میں نے گھر برباد ہوتے دیکھے ہیں۔

ڈاکٹر: خیر میں تو شادی کا ٹنٹا پالا ہی نہیں /اس لیے میں اس میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا/ میں صرف ایک بات کہتا ہوں/ کہ میرا روئے سخن اطہر کی طرف ہے/اطہر صاحب آپ اپنی ازواجی زندگی شوق سے تباہ کریں/ مگر اپنی بچی پر رحم کریں/میرے بھائی کچھ اندازہ ہے کہ اس جھگڑے کے اس پر کیا اثرات پڑیں گے /اس کی کچی عمر ہے/

اطہر: (جذباتی انداز میں) منی۔میری پیاری بیٹی منی۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

نجمہ: (چونک کر) اس وقت کون آ گیا (پکارتے ہوئے) آیئے۔

(زرینہ شیخ داخل ہوتی ہے)

نجمہ: (آگے بڑھ کر) ارے آپا زرینہ آپ؟ آپ کہاں بھول پڑیں۔

زرینہ: میں شاید آپ کی محفل میں مخل ہوئی ہوں۔

نجمہ: لیجیے آپ کیسی غربت کی باتیں کر رہی ہیں۔

زرینہ: بی بی سچی بات یہ ہے کہ میں سمجھ رہی تھی کہ اس وقت اطہر گھر پر نہیں ہوں گے۔ میں تم سے ایک دو باتیں کروں گی اور پھر چلی جاؤں گی۔سو چا تھا کہ مری جانے سے پہلے تمھیں مل لوں۔

نجمہ: مری جا رہی ہیں آپ؟

زرینہ: غنی صاحب کا اصرار تھا میں نے کہا ٹھیک ہے۔کیا مضائقہ ہے چلتے ہیں۔

جاوید: (زہر خند لہجے کے ساتھ) ہنی مون منانے؟

اطہر: (چکرا کر) کیا؟

جاوید: آپ لوگوں کو شاید پتہ نہیں ہے۔ میرے والدِ بزرگوار محترمہ زرینہ بیگم سے شادی کر رہے ہیں۔

نجمہ: (خوش ہوکر) ارے آپا زرینہ۔ ہمیں پتہ بھی نہیں۔ سب چپکے ہی چپکے کرلیا۔ خیر بہت خوشی کی بات ہے۔

ڈاکٹر: /(غصے سے) غلط ہے یہ/ جاوید صاحب آپ جھوٹ بول رہے ہیں/

زرینہ: (مسکرا کر) اتنے جذباتی ہوگئے تم۔ جاوید نے صحیح اطلاع دی ہے۔

ڈاکٹر: (مایوسی سے) اچھا؟/(رُک کر) ٹھیک ہے/ گویا ایک بار پھر تمہارے ہاتھ پیلے ہو رہے ہیں۔

زرینہ: کیا مضائقہ ہے۔

ڈاکٹر: کوئی مضائقہ نہیں ہے/ سیٹھ غنی اچھے آدمی ہیں/ اپنا دوست شیخ جو تھا/ اس کے جیسے ان کے لچھن نہیں ہیں/ پینے پلانے کا انھیں سرے سے شوق نہیں/ اور میرے خیال میں بیوی کو مارنے پیٹنے کی بھی ایسے قائل نہیں ہیں/

زرینہ: تم میرے مرحوم شوہر کو معاف نہیں کر سکتے۔ اللہ بخشے ان میں خوبیاں بھی تھیں۔

ڈاکٹر: (تلخ ہنسی) اُن سے زیادہ سیٹھ غنی میں خوبیاں ہیں/ (کھڑا ہو جاتا ہے) اچھا حضرات ہم چلے/

اطہر: بیٹھیے ڈاکٹر صاحب۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

ڈاکٹر: بس اپنے دوست پروفیسر کے ساتھ بیٹھ کر غم غلط کریں گے۔ (نکل جاتا ہے)

جاوید: (زرینہ سے)۔۔۔ یہ ڈاکٹر آپ سے خاسا بے تکلف نظر آتا تھا؟

زرینہ: (مسکرا کر) فاروقی اچھا آدمی ہے ایک وقت میں تو اس سے بہت تعلقات تھے۔ موصوف تھوڑے سے دل پھینک بھی ہیں۔ مجھ پہ ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے (ہنس کر) اور بھئی آپ لوگوں۔۔۔۔[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں]

جاوید: آپ سب کچھ اگلے دے رہی ہیں۔ آپ کو یہ خیال نہیں آتا کہ سیٹھ صاحب کا فرزندِ ارجمند یہ سب کچھ سن رہا ہے۔ اور وہ سب کچھ ان کے گوش گذار کر سکتا ہے۔

زرینہ: جاوید میاں۔ تم کیوں یہ زحمت کرو۔ میں تو غنی صاحب کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکی ہوں۔

جاوید: واقعی؟

زرینہ: میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا۔ جب میں نے دیکھا کہ ان کی شادی کی نیت ہے تو میں نے اپنے متعلق ایک ایک بات ان سے کہہ ڈالی۔ میں سوچا کہ دوسرے بعد میں ان کے کان بھریں گے میں ہی کیوں نہ یہ سب بتادوں۔

جاوید: آپ واقعی بہت بے تکلفی برتی۔ ورنہ بہت سی خواتین ایسی باتیں چھپاتی ہیں۔

زرینہ: عورت کے لیے بہترین پالیسی یہی ہوسکتی ہے کہ وہ سب کچھ صاف صاف بتادے۔

اطہر: نجمہ سن رہی ہو۔

زرینہ: ویسے غنی صاحب نے بھی اپنے کوئی بات مجھ سے چھپا کر نہیں رکھی اور نجمہ تم تو جانتی ہو۔ بیچارے غنی صاحب کا پالا کس سے پڑا ہے وعظ سنتے سنتے عمر گذر گئی۔ ذرا ذرا سی بات پر شک اور نہ کوئی وجہ نہ کوئی بنیاد۔

نجمہ: ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے؟

جاوید: اگر آپ دونوں اس موضوع کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں تو پھر میں یہاں سے سرک جاؤں۔

زرینہ: اچھا تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ سو میں آگے کچھ نہیں کہوں گی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے خفیہ خفیہ کچھ نہیں کیا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میرے بھاگ کھل گئے۔ ایک لحاظ سے یہ بات صحیح ہے لیکن یہ دوطرفہ سودا ہے۔ اس وقت انھیں بھی کسی ایسے کی ضرورت تھی جو انھیں سہارا دے۔ ان پہ جو مجبوری کا وقت آنے والا ہے۔ اس میں میں انھیں اکیلا تو نہیں چھوڑوں گی۔

اطہر: (تعجب سے) مجبوری؟ کیسی مجبوری۔

جاوید: (زرینہ سے) اس کے ذکر کی یہاں کیا ضرورت ہے۔

زرینہ: اے ہے اس میں چھپانے کی کیا بات ہے اور اب یہ بات چھپی کیسے رہے گی۔ غنی صاحب کی بینائی تیزی سے زائل ہو رہی ہے۔

اطہر: اچھا؟

زرینہ: اچھا بی بی۔ دیر ہو رہی ہے۔ میں چلی (اطہر سے) ہاں اطہر تمہارے لیے غنی صاحب کی

طرف ایک پیغام ہے اگر تمھیں کسی قسم کی بھی ضرورت ہوتو۔۔۔

نجمہ: (بات کاٹتے ہوئے) نہیں آیا۔ اطہر کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سیٹھ صاحب کا بہت بہت شکریہ۔

اطہر: محترمہ آپ اپنے ہونے والے شوہر کا میری طرف سے شکریہ ادا کریں اور بتا دیجیے کہ میں عنقریب ان کی خدمت میں حاضر ہونے والا ہوں۔

جاوید: کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

اطہر: میں سیٹھ صاحب کی خدمت میں جا کر معلوم کروں گا کہ انھوں جو مجھ پر نوازشات کی ہیں۔ وہ رقم کل کتنی ہے۔ میں یہ ساری رقم ادا کروں گا۔

نجمہ: اطہر ہوش کی دوا لو۔

اطہر: (نجمہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے۔ زرینہ سے مخاطب ہوتا ہے) اور اپنے ہونے والے شوہر کو بتا دیجیے کہ میں اپنے جس پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں اس سے حاصل ہونے والی ساری رقم ان کی نذر کی جائیگی۔ اور حساب بے باک کیا جائے گا۔

زرینہ: (تجسس آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) مجھے لگتا ہے کہ یہاں کوئی بات ہوئی ہے۔

اطہر: محترمہ آپ نے ٹھیک سمجھا ہے۔

زرینہ: اچھا میں چلتی ہوں۔

(نجمہ اسے رخصت کرنے کی نیت سے ساتھ ساتھ جاتی ہے)

اطہر: (تحکمانہ انداز میں) بس دروازے تک، دہلیز نہیں پار کرنی ہے۔

(زرینہ نکل جاتی ہے۔ نجمہ دروازہ بند کر لیتی ہے)

جاوید: (اطہر سے) دیکھا؟ اب مجھے داد دو۔ میں نے کتنا صحیح فیصلہ کیا تھا کہ اس گھر کو چھوڑ دیا (غصے سے) نئی شادی رچائی جا رہی ہے۔

اطہر: مگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔

جاوید: کہو۔

اطہر: جسے تم سچی شادی کہتے ہو۔ وہ مجھے تو نصیب نہیں ہوئی مگر تمہارے والد کی قسمت میں ایسی شادی تھی۔

جاوید: (برہمی سے) پھر؟

اطہر: تم اس بات پر زور دیے رہے تھے گویا یہ شادی دیانت خلوص اور سچائی کی بنیاد پر ہو رہی ہے اس میں کوئی جھوٹ شامل نہیں۔

[منی داخل ہوتی ہے بہت خوش نظر آ رہی ہے ایک پیکٹ اس کے ہاتھ میں ہے]

نجمہ: ارے تم پھر آ گئیں۔

منی: (بہت خوشی سے) امی، امی یہ دیکھو آنٹی زرینہ مجھے یہ دے کے گئی ہیں۔ سالگرہ کا تحفہ (ایک پیکٹ نجمہ کے ہاتھ میں پکڑا دیتی ہے)

اطہر: (تلخی سے) سالگرہ کا تحفہ

نجمہ: آپا زرینہ ہر سالگرہ پر منی کو کوئی پیارا سا تحفہ دیا کرتی ہیں۔

اطہر: یہ کیا ہے؟

منی: نہیں پاپا۔ آپ ابھی اسے نہیں دیکھیں گے۔ کل سالگرہ کے وقت امی اس پیکٹ کو کھولیں گی۔

اطہر: (غصے سے) یہ کیا چکر ہے۔ مجھ سے کیوں چھپایا جا رہا ہے؟

منی: (قریب آ کر) پاپا۔ آپ ناراض مت ہوں (لفافہ اس کے ہاتھ میں دے کر) یہ لفافہ بھی ہے اس میں خط ہے۔ ضرور اس میں کوئی اچھی سی بات ہوگی۔ اسے کھول کر پڑھ لیں۔

اطہر: (شک بھرے لہجے میں) اچھا خط بھی ہے کیا چکر ہے یہ (لفافے کو غور سے دیکھ کر) ہینڈ رائیٹنگ تو سیٹھ کا ہے۔

نجمہ: (تعجب سے) اچھا؟

اطہر: بیٹی لفافہ کھول کر پڑھ لوں؟

نجمہ: یہ سالگرہ کا تحفہ ہے۔ میرے خیال میں یہ لفافہ بھی کل ہی کھلنا۔

اطہر: (غصے سے) ٹھیک ہے (منی سے) یہ لو اپنی امانت۔

منی: (خوشامدانہ) نہیں پاپا۔ امی کو کہنے دیں۔ آپ یہ لفافہ کھول لیں۔ دیکھیں تو سہی اس میں کیا لکھا ہے۔

اطہر: کھول لوں؟

منی: ہاں ہاں کھول لیں۔

[اطہر لفافہ کھول کر پڑھتا ہے۔ چہرے پر غصے۔۔۔۔۔[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں]

نجمہ: کیا لکھا ہے خط میں؟

منی: پاپا کیا ہے خط میں؟

اطہر: (خط منی کو دیتے ہوئے) خود پڑھ لو۔
(منی خط لے کر پڑھنے کی کوشش کرتی ہے)

منی: (نجمہ کو دیتے ہوئے) آپ پڑھ کر کیوں نہیں سنا دیتے۔

اطہر: (خط پر ایک نظر ڈال کر) سیٹھ صاحب منی کو لکھتے ہیں کہ تمہارے دادا جان کو نقل نویسی کی زحمت کرنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دفتر سے جو رقم اجرت کے طور پر ملا کرتی تھی۔اب اس سے دگنی رقم۔۔۔[یہاں پر ایک سطر قابل قرأت نہیں]۔۔۔۔ادا ہوتی رہے گی۔

جاوید: (طنزیہ) سبحان اللہ۔

منی: (خوش ہو کر) امی آپ سن رہی ہیں۔دادا ابا سنیں گے تو کتنے خوش ہوں گے۔

نجمہ: تعجب ہے۔

اطہر: ابھی اور سنیے۔ارشاد فرماتے ہیں کہ ان کے بعد یہ رقم منی کو ادا کی جاتی رہے گی۔

منی: (تلخی سے) نجمہ سن رہی ہو۔ یہ آخر منی پر کیوں نوازش ہوئی ہے۔

نجمہ: کیا وجہ ہوسکتی ہے۔سالگرہ کے حوالے سے شاید انھوں نے سوچا ہو کہ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

جاوید: اطہر۔ یہ کوئی چال ہے (یاد کرتے ہوئے) ہاں انھوں ے مجھ سے کہا تھا کہ اطہر کی جیسی تم ہوا باندھ رہے ہو ویسا وہ نہیں ہے۔

اطہر: (غصے سے) کیسا ہوں میں۔سیٹھ صاحب سمجھتے ہیں کہ میں بکاؤ مال ہوں۔

جاوید: اس خط کا جواب بتائے گا کہ میرا باپ سچا تھا میں۔

اطہر: (خط کو چاک کرتے ہوئے) میرا جواب یہ ہے۔

جاوید: (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) مجھے یہی توقع تھی۔

اطہر: (نجمہ کے قریب جا کر) میں ایک سوال کا جواب تم سے چاہتا ہوں۔ اگر یہ بات تھی تو اس شخص نے ہماری شادی کس مصلحت سے کرائی تھی۔

نجمہ: (گھبرائے ہوئے لہجے میں) میں تمھاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔

اطہر: میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ جو تمھاری بیٹی ہے کیا اسے میرے گھر میں رہنے کا حق حاصل ہے۔

نجمہ: (اچانک غصہ میں آ کر) اطہر ہوش میں تو ہو۔

اطہر: میں ہوش میں ہوں۔ بقائمی ہوش و حواس تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا تمھاری بیٹی میری بھی بیٹی ہے۔

نجمہ: (غصے سے چلا کر) مجھے پتہ نہیں۔

اطہر: (چلا کر) تمھیں پتہ نہیں (نجمہ غصے سے ہے اور جواب نہیں دیتی۔ اطہر آہستہ لہجے میں) میرے خیال میں میرا اس گھر میں کوئی کام نہیں ہے (کھڑا ہو جاتا ہے۔ باہر جانے لگتا ہے)

جاوید: اطہر، باولے مت بنو۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے آدمی کو سوچنا چاہیے۔

اطہر: اب سوچنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔

جاوید: بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔ قربانی، ایثار، ایک دوسرے کو معاف کرنے کا ظرف۔ یہ کچھ ہو تو تین افراد کا گھرانا سچی خوشی حاصل کر سکتا ہے۔

اطہر: کیسی خوشی، میرا گھر تو تباہ ہو چکا ہے۔ جاوید میری کوئی بیٹی ویٹی نہیں ہے۔
[منی حواس باختہ ہے۔ اچانک رونے لگتی ہے۔ اطہر کی طرف موڑتی ہے]

منی: پاپا۔

اطہر: (چلا کر) مت آؤ، میرے قریب۔
(منی دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی ہے)
دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔
[تیزی سے باہر نکل جاتا ہے منی سسکیاں لے کر رونے لگتی ہے]

نجمہ: (منی کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے سینے سے لگاتی ہے) مت رو میری بچی۔

منی: (سسکیاں لیتے ہوئے) پاپا چلے گئے۔

نجمہ: کوئی بات نہیں۔اس وقت سر پہ بھوت سوار تھا۔اتر جائے گا تو آجائیں گے۔

منی: نہیں نہیں اب نہیں آئیں گے۔

[دیر تک سسکیاں لیتی رہتی ہے۔ نجمہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی رہتی ہے۔ جاوید حیران و پریشان نظر آرہا ہے۔]

جاوید: نجمہ بھابی۔آپ یقین کریں کہ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں نے آپ لوگوں کے بھلے کے لیے کیا تھا۔

نجمہ: (تلخی سے) ہاں بھلے کے لیے کیا ہوگا۔ میں کچھ نہیں کہتی ۔(آسمان کی طرف اشارہ کر کے) وہ دیکھنے ولا۔ وہ انصاف کرے گا۔

منی: (روتے ہوئے نجمہ کو دیکھتی ہے) امی آپ جائیں۔ پاپا کو لے کر آئیں۔(زبردستی کھڑا کرتی ہے) امی آپ جائیں۔ پاپا کو منا کر لائیں۔(مشکل سے کھڑی ہوتی ہے)

نجمہ: اچھا ایک وعدہ کرو کہ تم نہیں روگی۔ پھر میں جاتی ہوں۔

منی: (آنسو پونچھ کر) میں نہیں روؤں گی۔

(نجمہ نکل جاتی ہے)

منی: (وقفہ کے بعد) جاوید انکل۔آپ مجھے ایک بات بتائیں۔

جاوید: ہاں ہاں پوچھو۔

منی: پاپا ایک دم سے مجھ سے پھر گئے۔ میری صورت دیکھنا نہیں چاہتے یہ بات کیا ہے۔

جاوید: بیٹی ابھی تمھاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ جب بڑی ہوگی اس وقت پوچھنا۔

منی: اس وقت تک تو میں رو رو کر اپنی جان دے دوں گی۔(رُک کر) انکل کیا میں پاپا کی بیٹی نہیں ہوں۔

جاوید: یہ تم کیسی بات کر رہی ہو۔

منی: انکل ایسا تو نہیں ہے کہ امی کو میں کہیں پڑی مل گئی تھی۔ مگر انھوں ے یہ بات پاپا کو نہ بتائی۔اب انھیں پتہ چلا ہے۔

جاوید: یہ خیال تمھیں کیسے آیا۔

منی: میں نے کہانیوں میں یہ بات پڑھی ہے۔

جاوید: پھرتم سے تمہارا پاپا اور امی اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟

منی: انکل مرغابی بھی تو ہماری اپنی نہیں ہے۔ بس ہمیں مل گئی ہے۔ پر میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔

جاوید: اچھا اچھا مرغابی۔ بیٹی ایک بات بتاؤ تم اس مرغابی کو بہت چاہتی ہو۔

منی: بہت۔ میں روز رات کو اس کے لیے دعا مانگتی ہوں۔

جاوید: کیا دعا مانگتی ہو۔

منی: یہی کہ وہ زندہ رہے (رقعت کے لہجہ میں) پاپا کہتے تھے کہ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا۔

جاوید: نہیں وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتا۔ اور میرے ہوتے ہوئے اس کی مجال ہے کہ وہ تمھاری مرغابی کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھے۔ مگر ایک بات بتاؤ تمھیں اپنے پاپا سے بہت پیار ہے نا۔ تم ان کے لیے قربانی دے سکتی ہو۔

منی: میں ان کے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتی ہوں۔

جاوید: نہیں اپنی جان نہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی خاطر اپنی سب سے پیاری چیز قربان کرنی پڑتی ہے۔ تو پاپا کو واپس لانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جو چیز تمھیں سب سے زیادہ پیاری ہے اسے قربان کر دو۔

منی: (سوچتے ہوئے) کون سی چیز؟

جاوید: اپنی مرغابی۔

منی: (سوچ میں پڑ جاتی ہے دیر بعد تامل سے) میں مرغابی کو قربان کر دوں تو پاپا واپس آ جائیں گے؟

جاوید: میں اسے یقین دلاؤں گا کہ تمھاری بیٹی نے اپنی سب سے عزیز چیز تم پر قربان کر دی ہے۔ بس پھر تمہارے پاپا کو ہوش آ جائے گا۔

منی: سچ مچ؟

جاوید: ہاں سچ مچ۔ مگر یہ بات میرے اور تمہارے درمیان رہے گی۔ کسی اور کو پتہ نہیں چلنا

چاہیے۔

[نجمہ داخل ہوتی ہے حیران پریشان ہے۔ بے سدھ جا کر کرسی پر دھم سے بیٹھ جاتی ہے منّی بھاگ کر قریب آ کر)

منی: امی۔ پاپا نہیں ملے؟

نجمہ: نہیں۔

جاوید: کوئی بات نہیں۔ اسے اس وقت تنہائی کی ضرورت تھی۔ تنہائی میں وہ اپنے آپ سے لڑے گا۔ اس کے اندر کا آدمی بیدار ہوگا۔ اور ایک نئی آ گاہی کے ساتھ وہ واپس آ گئے گا۔

نجمہ: (دانت پیس کر) جاوید۔ تمھاری ان باتوں نے ہمیں تباہ کر دیا (چلا کر) وہ اکیلا نہیں ہے ۔ڈاکٹر فاروقی کے ساتھ ہے۔ ڈاکٹر پتہ نہیں اسے کہاں لے گیا ہے۔

جاوید: ڈاکٹر کے ساتھ ہے۔ اچھا؟ پھر تو غلط بات ہے۔

منی: (رونے لگتی ہے) پاپا نہیں آئیں گے۔

جاوید: (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) آئے گا کیسے نہیں آئے گا۔ منی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے لے کر آ ؤں گا۔ (جاتے ہوئے) رونا مت۔

[تیزی سے نکل جاتا ہے۔ منی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔)

نجمہ: (اسے گلے لگاتے ہوئے) مت رو بیٹی۔

منی: پاپا نہیں آئیں گے۔ (دونوں سسکیاں بھر کر روتی ہیں۔)

(پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر

[وہی کمرہ۔ صبح کا وقت۔ یہ سخت جاڑے کی صبح ہے۔ اس لیے دریچے کے شیشوں پر کُہرہ جما نظر آتا ہے۔ نجمہ ایک جھاڑن اور گرد صاف کرنے والا لمبا برش لیے اپرن پہنے نمودار ہوتی ہے اور صوفے کرسیاں صاف کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اتنے میں تیزی سے منی داخل ہوتی ہے۔]

نجمہ: خیر تو ہے کیا بات ہے؟

منی: امی۔امی۔ پاپا ڈاکٹر انکل کی طرف ہیں۔

نجمہ: کیسے پتہ چلا؟

منی: مائی کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر انکل رات بہت دیر سے آئے تھے۔اور ان کے کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔وہ کہتی تھی کہ دوسری آواز پاپا کی تھی۔

نجمہ: مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تمہارے پاپا ڈاکٹر صاحب کی طرف ہیں۔

منی: (رقعت بھرے لہجے میں) مگر امی۔وہ وہاں کیوں ہیں۔کیا وہ گھر نہیں آئیں گے۔

نجمہ: آئیں گے کیسے نہیں۔میں ابھی جاتی ہوں اور ان کی خبر لیتی ہوں۔

[مراد علی اوور کوٹ پہنے مفلر لپیٹے اپنے کمرے سے برآمد ہوتے ہیں۔منہ میں پائپ، ہاتھ میں چھڑی۔]

مراد علی: (دروازت میں کھڑے کھڑے) اطہر میاں (رُک کر) اطہر میاں نظر نہیں آرہے۔

نجمہ: (صوفہ جھاڑتے ہوئے) یہاں نہیں ہیں۔

مراد علی: (تعجب سے) باہر؟ اتنی سویرے۔اور ایسے موسم میں۔بہت سردی ہے۔دانت بج رہے ہیں۔باہر کیوں جانے دیا اتنی صبح۔

نجمہ: وہ میری سنتے ہیں۔

مراد علی: ہاں سنتا وہ کسی کی نہیں۔اچھا ٹھیک ہے۔ہم اکیلے ہی سیر کو نکلتے ہیں۔

نجمہ: ابا جان سردی بہت ہے۔

مراد علی: مجھے کچھ نہیں کہتی۔

[اپنے کمرے سے بڑے کمرے میں آتے ہیں باہر کھلنے والے دروازے سے نکل جاتے ہیں۔]

منی: امی، دادا ابا کو ابھی کسی بات کا پتہ نہیں۔

نجمہ: اچھا ہی ہوا کہ وہ اس وقت گھر ہی نہیں تھے۔انھیں پتہ نہ ہی چلے تو اچھا ہے (رُک کر) مگر بات کب تک چھپی رہے گی۔

(جاوید داخل ہوتا ہے)

جاوید: اطہر کا کچھ پتہ چلا۔

نجمہ: پتہ چلا ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں ہیں۔

جاوید: (برہمی سے) ڈاکٹر فاروقی کے کمرے میں۔ کیا واقعی وہ اس ملعون کے ساتھ گھومتا پھرتا رہا ہے۔

نجمہ: خیال تو یہی ہے۔

جاوید: اسے تنہائی کی ضرورت تھی کہ کچھ غور و فکر کرتا اپنے بارے سوچتا اور اس پریشانی سے نکلتا۔
(ڈاکٹر فاروقی داخل ہوتا ہے)

منی: انکل پاپا آپ کی طرف ہیں۔

ڈاکٹر: /ہاں بیٹی/

نجمہ: آپ نے ہمیں بتا دیا ہوتا۔

ڈاکٹر: اس کمبخت کو سنبھالتا/ یا تمھیں آ کر بتاتا/ پھر میں سو گیا۔

نجمہ: اب کیا کہتے ہیں۔

ڈاکٹر: /اب وہ چپ ہیں/

منی: انکل پاپا نے آپ سے کوئی بات تو کی ہوگی۔

ڈاکٹر: /اب تو بالکل چپ ہے/ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔/

جاوید: یہ اچھی بات ہے اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔۔

نجمہ: مگر کیا کر رہے ہیں؟

ڈاکٹر: / آرام سے سو رہا ہے/

منی: (حیران ہو کر) لمبے لمبے خراٹے لے رہے ہیں؟

ڈاکٹر: ہاں/ لمبے لمبے خراٹے لے رہا ہے/

نجمہ: ہاں وہ خراٹے بہت لیتے ہیں۔

جاوید: ویسے یہ بات سمجھ میں آتی ہے ایسے روحانی اضطراب کے بعد ایسی ہی نیند آتی ہے۔

نجمہ: پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ رات کو کبھی اس طرح باہر نہیں رہے۔ خیر اچھا ہے۔ کہ نیند آ گئیں۔ انھیں سونے ہی دیں۔ ذرا تھکن اتر جائے۔ اتنی دیر میں۔ ذرا ان کے کمرے کی صفائی کر

لوں۔آؤ منی۔

(دونوں بغلی دروازے سے نکل جاتے ہیں)

جاوید: ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر: / کس بارے میں/

جاوید: یہ جو اطہر اس وقت ایک روحانی آشوب سے گذر رہا ہے۔

ڈاکٹر: (تحقیر آمیز انداز میں) روحانی آشوب/ کیسا روحانی آشوب/

جاوید: دیکھیے ڈاکٹر صاحب اس وقت اطہر کی پوری زندگی ایک بحران کی لپیٹ میں ہے۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔

جاوید: اس میں کیا مضائقہ ہے۔

ڈاکٹر: کوئی مضائقہ نہیں/ مگر تم ہمیشہ ٹھوکر کھاتے ہو/ جسے ہیرو سمجھتے ہو/ وہ کانا کھلتا ہے/ یہاں بھی یہی صورت ہے/

جاوید: اچھا اگر یہ بات ہے اور اطہر ایسا ہی گیا گذرا ہے تو آپ کس خوشی میں اس کے لیے اتنا تردد فرما رہے ہیں۔

ڈاکٹر: بھئی میں تو ڈاکٹر ہوں/ اگر ایک بیمار آدمی کے ساتھ رہتا ہوں تو اس کے علاج معالجہ کی فکر مجھے کرنی ہی چاہیے۔

جاوید: کیا علاج فرما رہے ہیں آپ اس کا۔

ڈاکٹر: زہر کو زہر مارتا ہے/ اس کا جو خبط ہے/ اس خبط کو میں توڑ کے طور پر استعمال کر رہا ہوں/

جاوید: وہ کس طرح؟

ڈاکٹر: میں ڈاکٹر ہوں/ عطائی کو اپنا طریق علاج نہیں سمجھا سکتا/ تم نے پہلے ہی اس کا کیس بہت خراب کر دیا ہے/ میں نے تمھیں اپنا طریقہ بتا دیا/ تو اسے بھی ٹوٹکے کے طور پر برتو گے/ اور کیس مزید خراب کرو گے/ (ہنس کر) مگر میجر کمال آدمی ہے/ اس نے اپنا علاج خود ہی کر لیا/

جاوید: وہ کیسے؟

ڈاکٹر: دیکھتے نہیں ہزارہ کے جنگلوں میں شکار کھیلنے والا/ کس اطمینان سے اپنے چھوٹے سے

احاطہ میں بندوق چلاتا ہے /وہ جو ایک دوٹوٹے ہوئے درخت احاطے میں کھڑے ہیں /
وہ اس کے لیے ہزارہ کے کسی جنگل سے کم نہیں ہیں /ادھر اُدھر بھاگتے خرگوش کو ہرن سمجھتا
ہے / ریچھ اور بندر بھی اس کے لیے اب یہی خرگوش ہیں / بندہ خدا اپنے حال میں مگن
ہے۔

جاوید: (ٹھنڈا سانس بھر کر) میجر انکل کے جوانی میں کیا آئیڈیل تھے۔اب ان کی شکل کیا ہے
کیا ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر: اے سیٹھ غنی کے نور نظر /یہ کیا تم آئیڈیل! آئیڈیل کی رٹ لگائے رکھتے ہو /یہ اجنبی زبان
کا لفظ ہے /ہماری سمجھ میں نہیں آتا /ہماری دیسی زبان میں اس کے لیے ایک لفظ ہے /

جاوید: اس کی زندگی میں ایک نیا باب شروع ہوسکتا ہے تو اطہر جس قسم کا شخص ہے میرا مطلب ہے
کہ ایک حساس شخصیت۔۔۔۔۔

ڈاکٹر: (بات کاٹتے ہوئے) حساس شخصیت /؟ پٹڑی سے اترا ہوا آدمی ہے / تم اسے حساب
شخصیت کہتے ہو /اور یہ آج کی بات نہیں ہے /موصوف لڑکپن ہی میں کھسک گئے تھے۔

جاوید: یہ کیسے ہوسکتا ہے۔لڑکپن میں تو اسے سب سے پیار ملا ہے۔

ڈاکٹر: اس پیار نے تو اسے خراب کیا ہے /وہ جو اس کی خالہ اماں اور خالہ بی تھیں /خیر سے دونوں
ہی کھسکی ہوئی تھیں /ان کا لاڈ پیار اسے لے بیٹھا /وہ دونوں سمجھتی تھیں کہ ان کا لاڈلہ بھانجا
بہت ذہین ہے /

جاوید: کیا غلط سمجھتی تھیں۔

ڈاکٹر: مجھے تو اس میں کبھی کوئی ذہانت نظر نہیں آئی۔ہاں میجر صاحب اپنے بیٹے کو جینیس سمجھتے ہیں
/ مگر میجر صاحب خود ہمیشہ سے اوّل نمبر کے الّو ہیں /۔عقل سے بالکل پیدل ہیں /

جاوید: باپ بیٹے کا قائل تھا۔صرف اتنی بات تو نہیں ہے۔

ڈاکٹر: ہاں ہاں کالج میں بھی اس نے اپنی ذہانت کا سکہ جمایا ہوا تھا / خوبصورت نوجوان تھا /
رومنٹک پوز بنا رکھا تھا / سو اس پر لڑکیاں فدا تھیں / دوسروں کے شعر حفظ کر رکھے تھے /
دوسروں کے خیالات اپنے اندر گھوٹ لیے تھے / بس وہ اگل دیتا تھا / یہ تھی اس کی
ذہانیت /

جاوید: آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سب اندھے تھے اور میں جو اس کا اتنا قائل ہوں۔ میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ میں اندھا ہوں۔

ڈاکٹر: اندھے نہ سہی مگر بیمار تو ہو نا/

جاوید: (اداس ہو کر) ہاں میں بیمار آدمی تو ہوں۔

ڈاکٹر: ویسے تمہارا کیس زیادہ الجھا ہوا ہے /ایک تو تم ضمیر کے بھبھل بوسے میں لپٹے ہوئے ہو/ اپنی جانِ ناتواں کے ساتھ آئیڈیل کا لیبل لگا رکھا ہے /اوپر سے ہیرو پرستی کا بخار چڑھا رہتا ہے۔/ تمھیں کوئی ہیرو چاہیے/ جس کی تم پرستش کر سکو/

جاوید: کیا؟

ڈاکٹر: / جھوٹ/

جاوید: (جوش میں آ کر) ڈاکٹر تم کان کھول کے سن لو۔ جب تک میں اپنے دوست کو تمہارے چنگل سے نکال نہیں لیتا۔ میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

ڈاکٹر: یہ تم اپنے دوست کے حق میں برا کرو گے /اگر کسی خبطی سے اس کی ضد کو چھین لیا جائے تو/ یہ گویا اس کی خوشی چھین لینے کی حرکت ہے۔(منی داخل ہوتے دیکھ کر) /اچھا بیٹی/ میں تمہارے پاپا کو جا کر دیکھتا ہوں/ کہ بخار کچھ اُترا یا نہیں/(نکل جاتا ہے)۔

جاوید: منی تم نے ابھی تک وہ کام نہیں کیا۔ ہیں نا؟

منی: کون سا کام؟ (یاد کرتے ہوئے) اچھا اچھا مرغابی والا کام۔

جاوید: میرا خیال ہے تمھاری ہمت جواب دے گئی ہے۔

منی: نہیں انکل یہ بات نہیں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جاوید: فائدہ۔ تم ابھی بچی ہو۔ کاش تم سمجھ سکتیں کہ آدمی جب کوئی قربانی دیتا ہے تو اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ (ٹھنڈا سانس بھر کر) میں سمجھا نہیں سکتا۔ اچھا ٹھیک ہے۔

[نکل جاتا ہے۔ منی سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ برآمدے میں کھلنے والا دروازے سے مراد علی داخل ہوتے ہیں۔]

منی: دادا ابا۔ آج آپ بہت جلدی واپس آ گئے۔

مراد علی: بیٹے اکیلے ٹہلنے میں لطف نہیں آتا۔

منی: (سوچ کر) دادا ابا آج آپ شکار نہیں کریں گے؟

مراد علی: نہیں بیٹی۔ آج ہماری طبیعت حاضر نہیں ہے اور ویسے بھی آج بہت سردی ہے۔

منی: دادا ابا۔ یہ بتایئے آپ ہمیشہ خرگوش ہی کا شکار کیوں کرتے ہیں دوسرے جانور بھی تو ہیں۔

مراد علی: مثلاً

منی: مثلاً مرغابی۔

مراد علی: (ہنس کر) اچھا اچھا تمھیں یہ ڈر ہے کہ کہیں کسی دن میں تمھاری مرغابی کو شکار نہ کرلوں۔
نہیں بیٹی میں اس کا شکار نہیں کروں گا۔

منی: نہیں نہیں میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا۔ ویسے دادا ابا کیا مرغابی کا شکار بہت مشکل ہوتا ہے۔

مراد علی: کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ گولی اگر بوٹے پہ لگ جائے تو مرغابی فوراً ہی ٹیں ہو جاتی ہے۔

منی: فوراً مر جاتی ہے؟

مراد علی: فوراً۔ اچھا میں ذرا چل کے ذرا نہاؤں دھوؤں۔

[اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ منی پھر سوچ میں ڈوب جاتی ہے۔ پھر اُٹھ کر میز کی دراز کھولتی ہے۔ پستول نکالتی ہے۔ غور سے اسے دیکھتی ہے مگر دروازہ کھلنے پر فوراً دراز میں رکھ دیتی ہے۔ نجمہ داخل ہوتی ہے۔]

نجمہ: تم یہاں کیا سٹر بٹر کر رہی ہو۔ جاؤ کچن میں جا کر دیکھو۔ میں نے چائے کے لیے پانی رکھ دیا ہے۔ دم آجائے تو چائے بنالو۔ پھر میں ناشتہ لے کر تمہارے پاپا کے پاس جاؤں گی۔

[منی فوراً نکل جاتی ہے۔ نجمہ میز کو صاف کر کے کاغذات سلیقہ سے لگاتی ہے کہ اچانک اطہر داخل ہوتا ہے اوورکوٹ لپیٹے ہوئے مگر ٹوپ سر پہ نہیں ہے۔ شیو بھی بڑی نظر آرہی ہے۔ بال بکھرے ہوئے۔ پتلون میلا۔ آکر دھم سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ نجمہ اسے غور سے دیکھتی ہے۔ تھوڑا خاموش رہتی ہے۔]

نجمہ: رات بھر کہاں رہے؟

اطہر: تمھیں اس سے غرض؟

نجمہ: ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ لیکن اپنی طرف دیکھو۔ کیا حال بنایا ہے اپنا۔

اطہر: کیا حال بنایا ہے؟

نجمہ: میں کیا بتاؤں۔ خود ہی آئینہ دیکھو۔ پتہ چل جائے گا۔

(منی داخل ہوتی ہے)

منی: امی چائے تو بن گئی ہے (کہتے کہتے اطہر پر نظر جاتی ہے لپک کر اس کی طرف جاتی ہے) پاپا۔

اطہر: (دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیل کر) مجھ سے دور رہو۔ نجمہ اسے میری نظروں سے دور رکھو۔ (منی سکتہ میں رہ جاتی ہے۔)

نجمہ: (آہستہ سے) منی میرے کمرے میں جا کر ذرا میرا بستر درست کر دو۔

[منی آہستہ سے نکل جاتی ہے۔ اطہر اٹھ کر اپنا سامان اکٹھا کرنے لگتا ہے۔ کتابیں۔ کپڑے وغیرہ۔ نجمہ غور سے دیکھتی ہے)

نجمہ: یہ کیا ہو رہا ہے؟

اطہر: میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ کوئی مجھے نہ روکے۔

نجمہ: میں تمھیں روکنے والی کون ہوتی ہوں (رُک کر) اور تو تمہارا اس گھر میں کوئی نہیں۔ مگر ابا جان سے رشتہ کیسے توڑو گے۔ انھیں کس پر چھوڑ کر جا رہے ہو۔

اطہر: وہ میرے ساتھ جائیں گے۔

نجمہ: گھر کا انتظام کر لیا ہے۔

اطہر: وہ بھی ہو جائے گا۔

نجمہ: بڑا گھر چاہیے۔ خرگوش، مرغیاں، تیتر، بٹیر الا بلا یہ سب کہاں رہیں گے۔

اطہر: اس الا بالا کے لیے میں کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ اسے تم سنبھالو اور تمھاری بیٹی۔

نجمہ: ان کے بغیر ابا جان ایک پل زندہ نہیں رہ سکتے۔

اطہر: میں نے اتنا کچھ قربان کیا ہے۔ وہ چند خرگوش اور مرغیاں قربان نہیں کر سکتے۔

نجمہ: جو سمجھ میں آئے کرو۔

[کچن والے دروازے سے نکل جاتی ہے۔ اطہر سامان اکٹھا کرتے کرتے میز پر جا کر دراز کھولتا ہے۔ کاغذات نکالتا ہے۔ ایک ایک کو دیکھتا ہے۔ میز پر رکھے کاغذات پر نظر ڈالتا ہے۔ چاک کیا ہوا لفافہ اٹھا کر غور سے دیکھتا ہے۔ مگر دروازے پر آہٹ سن کر فوراً

رکھ دیتا ہے۔ نجمہ ٹرے میں ناشتہ لگائے داخل ہوتی ہے۔ اطہر کے سامنے میز پر رکھ دیتی ہے۔]

اطہر: (غصے سے) یہ کس لیے؟

نجمہ: تمہارے لیے۔

اطہر: میرے لیے اب اس گھر میں کھانا پینا حرام ہے۔

نجمہ: آخر فاقہ تو نہیں کرنا ہے۔ رات کو بھی پتہ نہیں کچھ کھایا تھا یا نہیں کھایا تھا؟

[اطہر کوئی جواب نہیں دیتا۔ کاغذات اُلٹ پلٹ کرنے لگتا ہے]

اطہر: (بڑبڑاتے ہوئے) میں نے جو اپنی کچھ یادداشتیں قلم بند کی تھیں پتہ نہیں وہ فائل کہاں گیا۔

نجمہ: وہ فائل نہیں ملے گا۔ وہ سونے کے کمرے میں ہے۔

[اطہر اٹھ کر بغلی دروازے کی طرف جاتا ہے)

نجمہ: (اٹھتے ہوئے) تمھیں نہیں ملے گا۔ سب کچھ الٹ پلٹ کر دوگے میں نکال کر دیتی ہوں۔

[اتنی دیر میں اطہر دروازے پر پہنچ چکا ہے دروازہ کھول کر داخل ہوتے ہوئے رک جاتا ہے]

اطہر: (چلا کر) یہ لڑکی یہاں کیا کر رہی ہے؟

[منی سہمی ہوئی جلدی سے باہر نکلتی ہے اطہر اندر چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے نجمہ جاتی ہے۔ اندر سے دونوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آتی ہیں۔ منی سہمی ہوئی کھڑی رہتی ہے۔ پھر آہستہ سے میز کی طرف بڑھتی ہے پستول نکالتی ہے اور احاطہ میں کھلنے والے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اطہر فائل لیے آگے آگے، نجمہ پیچھے پیچھے داخل ہوتے ہیں۔ فائل میز پر رکھ کر اطہر کرسی پر بیٹھتا ہے ناشتہ کی ٹرے کو دیکھتا ہے نجمہ آگے بڑھ کر چائے بناتی ہے۔ اس کے سامنے سرکا دیتی ہے۔ اطہر تھوڑے سے تامل کے بعد چائے پینے لگتا ہے۔ پھر ایک توس اٹھا کر کھانے لگتا ہے۔]

اطہر: (کھاتے کھانے کی میز کا دراز کھولتا ہے) یہاں پستول کہاں گیا؟

نجمہ: یہیں تو تھا۔

اطہر: کہیں بھی نہیں ہے۔

نجمہ: پھرابا جان لے گئے ہوں گے۔اللہ توبہ اسے بھی شکار کریں گے۔

اطہر: (چاک کیے ہوئے خط کو اٹھا کر) ابھی تک یہیں پڑا ہوا ہے۔

نجمہ: میں نے اسے ہاتھ ہی نہیں لگایا۔

اطہر: میرا تو خیر اس خط سے کوئی تعلق نہیں۔میری بلا سے ضائع ہو جائے۔مگر تمھاری بیٹی کے نام ہے۔اس سے تعلق ہے اور ابا جان سے تو ضائع تو انھیں ہی کرنا ہے۔اس میں لیے میں اسے چھوڑے دیتا ہوں۔پھر وہ جو بھی فیصلہ کریں۔

[دراز سے گوند کی کوشیشی نکالتا ہے۔ایک کاغذ قینچی سے تراش کر اس پر گوند لگاتا ہے۔خط کے دونوں پرزوں کو ملا کر اس پر چپکا دیتا ہے]

اطہر: میں نے اسے چپکا دیا ہے۔اب اسے سنبھال کر رکھو۔مجھے نظر نہیں آنا چاہیے۔

جاوید: آ گئے۔ناشتہ کر رہے ہو۔گڈ

اطہر: مگر میں ابھی واپس جا رہا ہوں۔

جاوید: پاگل مت بنو۔

اطہر: جاوید مجھے ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔

جاوید: وہ تمھیں اس گھر میں ملے گا یہاں سے نکل کر تمھیں کہیں ذہنی سکون نہیں مل سکتا۔اور ذہنی سکون تمھیں میسر نہ آیا تو وہ جو تم اپنے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہو وہ دھرا رہ جائے گا۔

اطہر: کیسا پروجیکٹ؟

جاوید: تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ تم کوئی کمال کی ایجاد کرنا چاہتے ہو۔

اطہر: بکواس میں نہ تین میں نہ تیرہ میں کیا ایجاد کروں گا؟ وہ تو بس ایک خبط تھا اور اس خبط کا ذمہ دار ڈاکٹر ہے۔

جاوید: ڈاکٹر؟

اطہر: ہاں ڈاکٹر اس نے میرے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ میں کوئی بہت جینس قسم کی چیز ہوں اور فوٹو گرافی کے میدان میں کوئی نیا کارنامہ دے سکتا ہوں۔

جاوید: ہوں تو اس مکار آدمی نے یہ شوفہ چھوڑا تھا۔

اطہر: پھراس بالشت بھر کی لڑکی نے جسے میں نے اپنی بیٹی جانا تھااورٹوٹ کرمحبت کی تھی، مجھے بیوقوف بنایا۔

جاوید: اس نے کیسے بیوقوف بنایا؟

اطہر: مجھ سے زیادہ اسے یقین تھا میں فوٹوگرافی کی دنیامیں کوئی تیر ماروں گا۔یقین تو کیا تھا مجھ پر ایسا ظاہر کررہی تھی۔

جاوید: اطہر یار۔تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔اس معصوم کی عمر کیا ہے۔وہ تجھے کیا بیوقوف بناتی اتنی چالاک وہ کیسے ہوسکتی ہے۔

اطہر: تم نہیں سمجھتے جاوید۔زرینہ شیخ یہاں آکر گھنٹوں کے حساب سے بیٹھتی تھی۔نجمہ کے ساتھ کھسر پھسر کرتی رہتی تھی اور یہ لڑکی کان لگا کر سب سنتی تھی۔اس میں وہ چالاک ہوگئی۔یہ مجھے اب احساس ہوا کہ اسے سب کچھ پتہ ہے اور وہ زرینہ شیخ کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔اس وقت تو میں اس کی محبت سے اندھا ہو رہا تھا۔

جاوید: اطہر اگر منی اپنی محبت کا کوئی اٹل ثبوت پیش کر دے۔پھر تو کیا کرے گا۔(مرغابی کی آواز۔چونک کر) یہ کیسی آواز ہے۔اس کا مطلب ہے کہ مرغابی کو۔۔۔۔

اطہر: ہاں مرغابی کی دردناک آواز سنائی دی ہے۔جیسے اس کو گولی لگی ہو کیا ابا جان نے مرغابی کو۔

جاوید: (اعتماد سے) اطہر۔منی کی طرف سے محبت کا ایسا ثبوت پیش ہوگا کہ تجھ سے انکار بن نہیں پڑے گا۔ہوسکتا ہے کہ وہ تیرے لیے کوئی بڑی قربانی پیش کرے۔

اطہر: ارے یار تو کس دنیا میں رہتا ہے۔یہ اسے سالگرہ کا تحفہ ملا ہے اس کے پیچھے بہت کچھ ہے۔لوگ اشارہ کریں گے اور وہ مجھے چھوڑ کر ان کی گود میں جا بیٹھے گی۔

جاوید: بالکل غلط ہے۔

[احاطہ کی طرف سے گولی کی آواز سنائی دیتی ہے۔جاوید کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑتی ہے]

احمق آدمی سن یہ آواز۔گولی چلی تھی۔

نجمہ: ابا جان نے پھر کوئی شکار مارا۔

اطہر: (اٹھتے ہوئے) میں جا کر دیکھتا ہوں۔

جاوید: رُکو تمھیں پتہ ہے کہ یہ واقعہ کیا ہوا ہے۔

اطہر: (حیران ہو کر) واقعہ۔ کیسا واقعہ؟

جاوید: یہ ثبوت ہے۔

اطہر: کیسا ثبوت؟ کس بات کا ثبوت؟

جاوید: اصل میں یہ منی نے کام دکھایا ہے۔ اپنے دادا جان کو مرغابی کا شکار کرنے پر اکسایا۔

اطہر: وہ کس لیے؟

جاوید: اس نے سوچا تھا وہ اگر اپنی سب سے عزیز شئے کی قربانی دے دے تو تمھیں اس کی محبت کا یقین آ جائے گا اور تم پھر اسے چاہنے لگو گے۔

اطہر: (سوچ میں پڑ جاتا ہے) اچھا۔۔۔۔ واقعی۔ (جذباتی ہو کر) کتنی معصوم ہے یہ بچی۔

نجمہ: مگر یہ عجیب بات ہے اس کے دل میں کیسے سمائی پگلی (رو پڑتی ہے)

نجمہ: میری بچی۔ اطہر تم اتنے پتھر دل نہ بنو۔ دیکھو اس نے کیا کیا ہے۔

اطہر: (سوچتے ہوئے) وہ ہے کہاں؟

نجمہ: وہ میرے خیال میں اس وقت کچن میں چھپی بیٹھی ہے۔

[اطہر لپک کر بغلی دروازے کی طرف جاتا ہے جو کچن میں کھلتا ہے فوراً ہی واپس آتا ہے۔

]

اطہر: وہاں تو نہیں ہے۔

نجمہ: پھر اپنے کمرے میں ہوگی۔

[اطہر لپک کر دوسرے بغلی دروازے سے منی کے کمرے میں جاتا ہے اور فوراً واپس آتا ہے]

اطہر: وہاں بھی نہیں ہے (سوچ کر) کہیں باہر تو نہیں نکل گئی۔

نجمہ: اگر وہ اپنے کمرے میں بھی نہیں ہے تو پھر واقعی کہیں نکل گئی (وقفہ) میری بچی۔

اطہر: خدا کے لے منی کو لاؤ، کہاں ہے۔ وہ میں اسے بتاؤں کہ وہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اب میرے دل میں کوئی شک نہیں ہے۔

جاوید: (اطمینان اور مسرت کے ساتھ) مجھے پتہ تھا میں جانتا تھا کہ منی کوئی بڑی قربانی دے اور اس گھر میں ایک نئی زندگی کا باب شروع ہوگا۔

[مراد علی اپنی فوجی وردی میں اپنے کمرے سے نکلتے ہیں۔ اطہر انھیں دیکھ کر چونک جاتا ہے]

اطہر: ابا جان آپ اپنے کمرے میں تھے؟

نجمہ: تو ابا جان۔آپ نے اپنے کمرے میں گولی چلائی تھی۔

مراد علی: اطہر۔۔۔۔تم اکیلے شکار نکل گئے۔کون سا شکار کیا ہے۔

اطہر: (چکرا کر) تو آپ نے گولی نہیں چلائی تھی؟

جاوید: تو گویا منی نے خود مرغابی پر گولی چلائی ہے۔

اطہر: (پریشان ہوکر) اچھا؟ (بدحواس ہوکر احاطہ کی طرف دوڑتا ہے۔دروازہ کھول کر احاطہ کی طرف نظر ڈالیا ہے اور چلاتا ہے]

نجمہ: (بدحواسی میں اھاطہ کی طرف دوڑتی ہے) یہ کیا غضب ہوا؟

اطہر: (بدحواسی سے) منی تو بے ہوش پڑی ہے۔

نجمہ: (چیخ کر) منی منی

[نجمہ، اطہر اور جاوید تیزی سے نقل جاتے ہیں]

مراد علی: (مسکرا کر) یہ ننھی سی جان بھی اب شکار کھیلنے لگی۔

[تینوں فوراًواپس آتے ہیں اطہر منی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے۔منی بے ہوش ہے اور اس کے سیدھے ہاتھ میں پستول ہے اسے میز پر لٹا دیا جاتا ہے]

اطہر: اس کے ہاتھ میں پستول چل گیا۔جس سے وہ زخمی ہوگئی ہے۔ڈاکٹر کہاں ہے اسے جلدی بلاؤ۔(نجمہ دوڑتی ہوئی برآمد میں)

نجمہ: (چلا رہی ہے) ڈاکٹر صاحب جلدی آؤ۔میری بچی کو بچاؤ۔

(ڈاکر اور پروفیسر دونوں دوڑتے ہوئے آتے ہیں)

ڈاکٹر: کیا ہوا/منی کو دیکھیں/ارے/یہ کیا۔

(جلدی سے اسے الٹتا پلٹتا ہے۔معاینہ کرتا ہے)

نجمہ: وہ پستول لے کر نکل گئی تھی۔ مرغابی کو گولی مارنے چلی تھی۔ مگر۔۔۔۔

اطہر: مگر پستول اس طرح چلا کہ وہ خود ہی زخمی ہو گئی۔

مراد علی: (بڑبڑاتے ہیں) جنگل اپنا انتقام لیتے ہیں (احاطہ کی طرف نکل جاتے ہیں)

[ڈاکٹر معاینہ کرنے میں مصروف ہے نجمہ اور اطہر دونوں بے چینی سے دیکھ رہے ہیں۔]

اطہر: ڈاکٹر کچھ بولو۔

ڈاکٹر: گولی سینے میں لگی ہے/ گولی سینے میں لگی ہے/

نجمہ: میری بچی۔ بچ تو جائے گی؟

ڈاکٹر: (ٹھنڈا سانس بھر کر) بچی مر چکی ہے/

نجمہ: (رونا چیخنا شروع کر دیتی ہے) میری بچی۔

جاوید: (درد انگیز آواز میں) مرغابی جھیل کی تہہ میں اتر گئی۔

اطہر: (رقعت آمیز لہجہ میں) میں نے اس کیساتھ وہ سلوک کیا۔ جو جانوروں سے کرتے ہیں۔ وہ سہم کر احاطہ میں چلی گئی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے میری محبت میں جان دے دی۔ میں اس سے کیسے معافی مانگوں گا۔ کیسے اسے بتاؤں گا کہ (سسکیاں لے کر رونے لگتا ہے)۔

[اطہر آنسو پونچھتا ہے اب اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا ہے)

اطہر: (منی کے قریب جا کر کتنے سکون سے سو رہی ہے۔ منی آرام کر رہی ہے۔

نجمہ: اطہر۔ میری منی یہاں بے آرام ہے۔ اسے اندر لے چلو۔

اطہر: (منی کو اٹھاتے ہوئے) نجمہ تم یہ صدمہ کیسے برداشت کرو گی؟

نجمہ: ہم مل کر یہ صدمہ برداشت کریں گے وہ ہم دونوں کی ہے۔

[اطہر منی کو لے کر اپنے سونے کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے نجمہ جاتی ہے۔ ڈاکٹر بڑھ کر دروازہ بند کر دیتا ہے]

جاوید: پتہ نہیں یہ حادثہ کیسے ہوا۔

ڈاکٹر: /ایسے کہ اس نے پستول اپنے سینے پر رکھا/اور چلا دیا۔

جاوید: اس بچی کی قربانی ضائع نہیں گئی۔ اس موت نے اطہر کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر دیا ہے۔

ڈاکٹر: ہاں بعض لوگوں کے یہاں موت کو دیکھ کر ضمیر بیدار ہو جاتے ہیں / مگر کتنے دن کے لیے / ان کے ضمیر کی گھاس، برس بیتنے سے پہلے مرجھا گئی / اور اس کے ساتھ ہی اطہر کے لیے یہ موت بھولی بسری یاد بن جائے گی۔

جاوید: ڈاکٹر اگر تم سمجھے ہو۔ اور میں غلط ہوں تو پھر یہ زندگی جینے کے لائق نہیں ہے۔

(پردہ گرتا ہے)